DUE DATE

Late Fine Re 1 00 per day for first 15 days
Rs 2 00 per day after 15 days of the due date

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

وہاب اشرفی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ

راشد انور راشد

ماہنامہ کتاب نما۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

اڈیٹر	شاہد علی خاں
مہمان اڈیٹر	راشد انور راشد
فی شمارہ	10/
سالانہ	100/-
سرکاری اداروں سے	150/-
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی جہاز)	20 امریکی ڈالر یا 14 پونڈ

اس شمارے کی قیمت -/150

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ اردو بازار ۔ جامع مسجد دہلی ۔110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ پرنس بلڈنگ ۔ علامہ اقبال چوک ۔ ممبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ ۔ علی گڑھ ۔202002

پہلی بار مارچ ۲۰۰۵ء تعداد 500 قیمت -/ 150 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس ۔ دریا گنج ۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی

ترتیب

داریہ

وہاب اشرفی، موجودہ عہد کے سربرآوردہ نقادوں میں سے ایک ہیں۔ اردو تنقید میں یہ مقام انھوں نے بڑی محنت سے حاصل کیا ہے۔ زندگی کی ابتدائی منزلوں میں انھوں نے اپنے لئے جدوجہد کی جو راہ متعین کی تھی، آج بھی پوری ایمانداری کے ساتھ وہ اس پر عمل پیرا دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کے عزم اور حوصلے میں مزید استقلال پیدا ہوگیا ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی اور منصبی ذمے داریوں سے نجات کے بعد بیشتر لوگوں میں پہلے کی طرح جوش وخروش باقی نہیں رہتا اور شعروادب سے وابستگی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جاتی ہے، لیکن غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ سنجیدہ لوگوں کو غالباً ایسے ہی وقت کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اپنا تمام تر وقت ادھورے خوابوں کی تکمیل میں صرف کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر قابل ذکر کارنامے وجود میں آتے ہیں۔ شعر و ادب سے جنون کی حد تک وابستگی رکھنے والے ایسے ہی قبیلے سے وہاب اشرفی کا تعلق ہے۔ انھوں نے تاریخ ادبیات عالم کی سات ضخیم جلدیں اس وقت لکھیں، جب ان کے بیشتر ہمعصر علمی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوکر سفر حیات کی تھکن مٹانے میں مصروف تھے۔ اس بے مثال کارنامے کے بعد فی الوقت وہ تاریخ ادب اردو سے متعلق ایک ضخیم کتاب مکمل کرنے میں مصروف ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ عنقریب یہ کتاب بھی منظر عام پر آکر اپنے شیدائیوں کا حلقہ وسیع کرنے میں پیش پیش ہوگی۔ کئی اہم کتابوں کی متواتر اشاعت کے ساتھ ہی ان کا ادبی رسالہ ''مباحثہ'' بھی پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے جس نے ادبی حلقوں میں اپنی ایک خاص پہچان بنالی ہے۔ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور فارسی زبانوں پر اچھی خاصی دسترس رکھنے والے وہاب اشرفی کئی

لحاظ سے کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں، اور تنقید کے موجودہ منظر نامے پر اپنی ایک انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔

وہاب اشرفی کا تعلق صوفی خاندان سے ہے۔ ان کے والد سید شاہ حاجی امام الدین اپنے عہد کے اہم صوفی تھے۔ وہاب اشرفی کی پیدائش ۲ جون ۱۹۳۶ء کو بی بی پور (کاکو) میں ہوئی، جو ضلع جہان آباد کی ایک مردم خیز بستی رہی ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے کاکو میں ہی حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی سید عبدالجبار اشرفی کے ساتھ کلکتے کا سفر کیا اور وہیں آگے کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ لیکن تقسیم ہند کے سانحے کے بعد کلکتے کی فضا میں زہر گھولے جانے کی وجہ سے لوگ مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ چنانچہ ہزاروں لوگوں کے ساتھ وہاب اشرفی کو بھی اپنے بھائی کے ہمراہ نقل مکانی کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ڈھاکہ کی زندگی پریشانیوں کی آماجگاہ تھی، لیکن اس کے باوجود انھوں نے پڑھائی کا سلسلہ ترک نہیں کیا اور ڈھاکہ سے ہی ۱۹۵۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آگے کی تعلیم کے لئے انھوں نے ڈھاکہ میں ہی قائد اعظم کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن سیاسی خلفشار کے باعث انھیں اپنے بھائی کے ہمراہ دوبارہ کلکتہ واپس آنا پڑا۔ قیام کلکتہ کے دوران انھوں نے مختلف اخباروں میں کام کرتے ہوئے صحافت کا بیش قیمتی تجربہ بھی حاصل کیا۔ یہیں انھوں نے لائف انشورنس کے مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کی اور کامیاب ہو کر سروس کا آغاز پٹنہ سے کیا۔ ملازمت سے وابستہ ہونے کے باوجود انھوں نے پڑھائی سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور سے پہلے انگریزی اور بعد میں اردو ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۶۹ء میں مگدھ یونیورسٹی کے قدیم کالج، گیا کالج میں ان کی تقرری بحیثیت لیکچرر ہوگئی۔ ۱۹۷۶ء میں وہ ریڈر کی حیثیت سے رانچی یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف اردو سے وابستہ ہوئے اور صدر شعبہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ چند برسوں بعد رانچی یونیورسٹی میں ہی انہیں پروفیسر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ رانچی میں قیام کے دوران وہاب اشرفی نے وہاں کی ادبی و ثقافتی فضا کو سرگرم اور فعال بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ملازمت کے آخری ایام میں حکومت بہار کی جانب سے انھیں بہار یونیورسٹی پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی وہاب اشرفی نے ادب سے اپنی سنجیدہ وابستگی کا ثبوت دیا۔ کلکتے میں قیام کے دوران انھوں نے ماہنامہ ''صنم'' جاری کیا، جو تقریباً پانچ برسوں تک کامیابی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے نے بعض اہم اور یادگار شمارے شائع کیے جن میں

''بہار نمبر''اور''افسانہ نمبر'' کا ذکر خصوصی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ''صنم'' کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس عہد کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات اس میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ کلکتہ سے منتقلی کے بعد، ملازمت کی غرض سے انہوں نے گیا شہر میں سکونت اختیار کی اور اپنی صحافتی زندگی کا سلسلہ جاری رکھا۔ کلام حیدری کا ہفتہ وار اخبار''مورچہ'' ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھا۔ وہاب اشرفی نے اس اخبار میں ایک مستقل کالم''اپنا صفحہ'' کے نام سے لکھنا شروع کیا جس نے بہت جلد لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس کالم میں ان کی کسی بات سے اختلاف کرتے ہوئے محمود ہاشمی نے اپنی متضاد رائے پیش کی، اور پھر کسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی بھی اس بحث میں شامل ہو گئے۔ لہٰذا باقاعدہ ایک ادبی معرکے کا آغاز ہوا، جس نے ادبی دنیا میں گفتگو کے نئے دریچوں کو وا کرنا شروع کر دیا۔ یہ ادبی معرکہ کئی مہینوں تک ہفتہ وار''مورچہ'' میں اشاعت پذیر ہوتا رہا اور وہاب اشرفی کے کالم کی ہی بدولت''مورچہ'' کی مقبولیت پہلے کے مقابلے میں کافی بڑھ گئی (چند برسوں قبل ارتضیٰ کریم نے اس اہم ادبی معرکے کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے)۔

تنقید کے سلسلے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ایک تخلیق کار، ادبی سطح پر ناکام ہونے کے بعد ہی اس وادی میں قدم رکھتا ہے۔ اردو کے معتبر نقادوں کی ابتدائی ادبی زندگی اس بات کو ثابت بھی کرتی ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا میں شعر بھی کہے اور افسانے بھی قلم بند کیے، لیکن جلد ہی انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ تخلیقی میدان ان کے مزاج سے زیادہ میل نہیں کھاتا۔ لہٰذا انھوں نے تخلیقی ادب سے کنارہ کشی اختیار کر لی شروع کی اور ایک طویل عرصے سے وہ سلسلہ بالکل منقطع ہو چکا ہے۔ خاص طور پر افسانے تو انھوں نے ۱۹۶۵ء کے بعد لکھے ہی نہیں۔ البتہ منھ کا ذائقہ تبدیل کرنے کی غرض سے کبھی کبھار شعر اب بھی کہہ لیتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ وہ اشعار منظر عام پر نہیں آتے اور مخصوص نشستوں میں بے تکلف دوستوں کے درمیان ہی ان کا اظہار ہوتا ہے)۔ جہاں تک وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے، اس سلسلے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے محض منھ کا ذائقہ تبدیل کرنے کی غرض سے افسانے نہیں لکھے۔ سہیل عظیم آبادی اور اس عہد کے دیگر نمائندہ ادیبوں کی صحبتوں نے شعوری طور پر انھیں افسانے کی دنیا میں ایک پہچان قائم کرنے کے لئے اکسایا۔ انھوں نے چالیس سے زیادہ افسانے لکھے، جو ملک کے موقر رسالوں اور جریدوں کی زینت بنے۔ وہاب اشرفی نے ان افسانوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے گریز کیا، لیکن ان کے ایک عقیدت مند احمد حسین آزاد نے

مقدمہ لکھ کر ان کے افسانوں کا انتخاب ''وہاب اشرفی کے افسانے'' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہاب اشرفی نے اپنے عہد کے اہم رجحانات اور نمائندہ ادیبوں کا خاطر خواہ اثر قبول کیا ہے۔ اپنی انفرادی راہ متعین کرنے کے بجائے انھوں نے پیش رو فن کاروں کے بنے بنائے راستوں پر چلنا زیادہ مناسب سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگاری کے میدان میں علیحدہ طور پر وہ اپنی شناخت قائم نہیں کر پائے۔ غالباً انھیں اس حقیقت کا خود بھی احساس تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے افسانوں کو کتابی شکل میں پیش نہیں کیا۔ بہر حال وہاب اشرفی کے ادبی سفر کا جائزہ لینے کے دوران ان کی افسانہ نگاری کے مخصوص عہد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے افسانے قابل مطالعہ ہیں اور قاری ان سے بیزار نہیں ہوتا۔ انھوں نے بے رحم سماج کے ظلم وستم اور عام انسانوں کی مجبوری ولاچاری کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہاب اشرفی کی تنقید نگاری، ان کے ادبی سفر کے دوسرے دور سے تعلق رکھتی ہے، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرا دور بھی تعلیمی دور سے ہی متعلق ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا دور ۱۹۶۵ء سے قبل کا ہے، جو تقریباً پانچ برسوں کے عرصے پر محیط ہے۔ یعنی ایم اے سے قبل ہی انھوں نے افسانوی وادی میں قدم رکھا اور خاطر خواہ سیاحت کے بعد اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء میں بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ایم اے کرنے کے بعد جب وہ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اسی دوران انھوں نے اپنے تنقیدی ذہن کا ثبوت دیتے ہوئے ملا وجہی کی شہرۂ آفاق مثنوی ''قطب مشتری - ایک تنقیدی جائزہ''، کتابی صورت میں پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ دس برسوں بعد انھوں نے اس کتاب کا ایک دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع کیا، جس کا نام ''قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ'' ہے۔ بیشتر محققین پہلی کتاب کے پہلے ایڈیشن سے ناواقف دکھائی دیتے ہیں اور ۱۹۷۷ء میں ترمیم واضافے کے ساتھ منظر عام پر آئی کتاب کو ہی وہاب اشرفی کی پہلی تنقیدی کتاب تصور کرتے ہیں۔ بہر حال وہاب اشرفی نے اس کتاب میں ملا وجہی اور ان کی مثنوی ''قطب مشتری'' کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاب اشرفی کی یہ تنقیدی کاوش ان کے لئے ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہوئی اور ان کے باقاعدہ تنقیدی سفر میں ایک نیا موڑ آیا۔ گویا انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا تہیہ کر لیا کہ آئندہ تنقید کے ذریعہ ہی وہ اپنے محسوسات کو گویائی عطا کریں گے، اور درحقیقت انھوں نے ویسا ہی کیا۔

''قدیم ادبی تنقید''، وہاب اشرفی کی دوسری تنقیدی کتاب ہے جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے مغرب کے پانچ قدیم نقادوں ارسطو، افلاطون، ہورلیس، کوئن ٹیلیں اور لانجائنس کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ ارسطو اور افلاطون کے تنقیدی کارناموں سے اردو دنیا خاطر خواہ واقف ہے، لیکن بقیہ تین نقادوں سے اردو قارئین زیادہ آگاہ نہیں۔ اس بنا پر وہاب اشرفی کی یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے نہ صرف ان قدیم نقادوں کے تنقیدی خیالات سے باور کرانے کی کوشش کی ہے، بلکہ ان کے تنقیدی خیالات کے حوالے سے اپنے تنقیدی تاثرات بھی قلمبند کئے ہیں۔ یہ قدرے مشکل مرحلہ تھا، لیکن وہاب اشرفی نے اس نازک مقام پر احتیاط سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ایک اہم کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ مغرب کے اُن قدیم نقادوں سے متعلق دوسرے ادیبوں اور دانشوروں کے اہم تنقیدی شذرات کو بھی گفتگو کا حصہ بنایا اور تنقید کے بنیادگزاروں کو وسیع تناظر میں سمجھنے کی سعی کی۔ ارسطو کی مشہور زمانہ کتاب ''بوطیقا'' پر سیر حاصل تبصرہ اس کتاب میں موجود ہے۔ افلاطون کے نظریہ تصور یا نقل پر بھی وہاب اشرفی نے تفصیل سے لکھا ہے، البتہ ہورلیس، کوئن ٹیلیں اور لانجائنس کے تذکرے مختصر ہیں۔ غالباً اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ان نقادوں کے حوالے سے مغرب میں بھی زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا اور خاطر خواہ مواد دستیاب نہیں ہونے کی بنا پر وہاب اشرفی بھی اس گفتگو کو مزید آگے بڑھانے سے قاصر رہے، لیکن مغربی تنقید کے ان بنیادگزاروں کو وسیع تناظر میں سمجھنے کی کوشش ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے اس بات پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے کہ مغرب کے ان قدیم نقادوں کے ادبی نظریات آج بھی مشعل راہ کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ان نقادوں کے خیالات سے ہم لاکھ اختلاف کریں لیکن ان کے ادبی تصورات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

وہاب اشرفی نے اپنی تنقید کا معیار مشرقی اور مغربی دونوں سرچشموں سے متعین کیا ہے۔ وہ بہ یک وقت دونوں نظریوں کی اتباع میں یقین رکھتے ہیں۔ فن پاروں کا موضوع اور اسلوب بھرپور تجزیے کے لئے جس نظریہ نقد کی وضاحت کرتا ہے، وہ اظہار خیال کے لئے اسی طریقہ کار کو اختیار کرتے ہیں۔ اپنی تنقیدی کاوشوں میں انھوں نے اس تصور کے عملی نمونے پیش کیے ہیں۔ موضوع سے متعلق تمام بنیادی کتابیں ان کے مطالعے میں آتی ہیں، جن سے حسب ضرورت اتفاق اور اختلاف کی گنجائش وہ نکالتے ہیں۔ یہ بات ان کے تحقیقی اور تنقیدی مزاج کو واضح کرتی ہے، جس کے عمدہ نمونے ان کی تنقیدی تحریروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ''معنی کی تلاش'' وہاب اشرفی کے تنقیدی سفر کا تیسرا پڑاؤ ہے۔ یہ دراصل ان کے مختلف ادبی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو

ملک کے معتبر رسالوں میں وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے اور ادبی حلقوں میں مسلسل زیر بحث رہے۔ ''افسانے کا منصب'' اس مجموعے کا پہلا مضمون ہے، جو قدرے طویل ہے اور موضوع سے پوری طرح انصاف کرتا ہے۔ وہاب اشرفی نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جو افسانے کے تعلق سے عام طور پر کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ مضمون ماہنامہ ''شب خون'' میں شائع ہوا تھا، اشاعت کے فوراً بعد ہی اس پر شدید رد عمل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو آگے چل کر وہاب اشرفی، محمود ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے درمیان ادبی معرکے کے طور پر سامنے آیا۔ اس مضمون میں وہاب اشرفی نے بہت ایمانداری کے ساتھ مدلل انداز میں افسانے کی غرض و غایت، اس کی مقصدیت اور فن کے طور پر اس کی باریکیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مختلف مغربی ادیبوں اور ان کے تخلیقی فن پاروں کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ کسی بھی ادبی صنف کے مقابلے میں افسانے کی انفرادی حیثیت اور اہمیت کو کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی ادیبوں کے علاوہ وہاب اشرفی نے اردو کے افسانہ نگاروں کو بھی میادی حوالے کے طور پر پیش کیا اور ان کی انفرادیت واضح کرتے ہوئے بعض مغربی فن کاروں سے ان کے تقابلی مطالعے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ اس مضمون میں انھوں نے علامت نگاری کے حوالے سے بہت اہم بات کہی ہے۔

> ''علامت نگاری ایک طرح سے رومانی نظریے کے تخلیقی تصور پر مبنی ہے، جس میں فطرت اپنی تسلیم شدہ خدوخال، عادات و اطوار میں نہیں دیکھی جاتی، بلکہ تخیل کے آئینے میں کچھ اور ہی شئے بن جاتی ہے۔ لہٰذا اردو کے بہت کم افسانے علامتی افسانے بن پاتے ہیں''۔

وہاب اشرفی نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے مناسب دلیلیں بھی پیش کی ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں ان کے دعوؤں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ نمائندہ فن کاروں اور ان کے افسانوں کے حوالے سے انھوں نے علامتی اور غیر علامتی افسانوں کا فرق واضح کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی بدولت فن کی پیچیدہ گتھیوں کو سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔ نثری نظم اور کنکریٹ شاعری کے حوالے سے وہاب اشرفی کے مضامین ان کے سلجھے ہوئے ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ مبہم اور ادق تصورات کے بیان میں حیرت انگیز سادگی کا سہارا لیتے ہیں جس کی بنا پر بعض ناقابل فہم اصطلاحات اور نظریات بھی پڑھنے والوں کے لئے قدرے آسان ہو جاتے ہیں۔ احتشام حسین کا تنقیدی رویہ، شعر اقبال کا علامتی پہلو، اردو نثر کی روایت اور غالب کی انشاء

پرداری وغیرہ مضامین بھلے ہی موضوعات کی سطح پر ہمیں چونکاتے نہیں، لیکن ان مضامین میں بھی وہاب اشرفی نے گفتگو کا کوئی نہ کوئی نکتہ تلاش کر لیا ہے، دیگر مضامین میں جمیل مظہری اور اختر اورینوی کے کمالات فن کا احاطہ کرنے کے علاوہ انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کی بے حد اہم تنقیدی کتاب ''شعر، غیر شعر اور نثر'' کے حوالے سے عالمانہ گفتگو کی ہے، اور بعض امور پر اختلاف کرنے کے باوجود فاروقی کی اس کتاب کو اپنے عہد کی سب سے عمدہ کتاب کا درجہ دیا ہے۔ المختصر ''معنی کی تلاش''، وہاب اشرفی کے تنقیدی رجحان اور موقف کو واضح کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اس اولین تنقیدی مجموعے میں شامل ان کے مضامین کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب میں آفاقیت کے قائل ہیں اور چیزوں کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں، تا کہ ممکنہ حدود اور امکانات کی خاطر خواہ وضاحت ہو سکے۔

''مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ'' وہاب اشرفی کی اہم کتاب ہے، جس میں انھوں نے میر کی مثنویوں کو مختلف سیاق و سباق میں دیکھنے کی کوشش کی۔ بڑے فن کاروں کے حوالے سے اظہار خیال کے دوران اکثر ہم واضح طور پر غیر جانبداری کا ثبوت نہیں دے پاتے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ روایت سے ہٹ کر بالکل غیر متوقع بات کہنے سے خود نقاد کی صلاحیت شک کے دائرے میں آ جاتی ہے، لیکن دراصل اسی مقام پر نقاد کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کی رائے ادبی حلقوں میں اعتبار کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ ہر چند کے ابتدا میں بعض ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن نقاد اپنے تنقیدی موقف کے تئیں سچا اور ایماندار ہے تو تاخیر سے ہی سہی، اس کی رائے تسلیم ضرور کی جاتی ہے۔ ''مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ'' اسی نوعیت کی کتاب ہے جس میں وہاب اشرفی نے واضح طور پر مثنویات میر کی خامیاں اجاگر کی ہیں اور اردو شاعری کے ایک بنیادی ستون پر اظہار خیال کے دوران ان کا قلم مصلحت کی حسنتوں سے محفوظ رہا۔ ان کی یہ رائے ملاحظہ ہو

> ''میر کی مثنویوں کو اگر فن کی کسوٹی پر پرکھئے تو بہت مایوسی ہوگی۔ نہ ان کا اپنا کوئی پلاٹ ہے، نہ حسن رنانہ اور حسن مردانہ میں کوئی امتیاز ہے۔ دونوں ہی پری وش، ماہ تمثال، نازک اندام، نزاکت کی جان، غارت گردی و ایمان نظر آتے ہیں۔ فرق صرف تذکیر و تانیث کا ہے۔ یہ دونوں کبھی خوش قسمتی سے یکجا ہو جاتے ہیں تو گلہ و شکوہ میں وقت گذار دیتے ہیں   ان کی عشقیہ کہانیاں بالکل بے مقصد

ہیں''۔

مثنویات میر کے حوالے سے وہاب اشرفی کی مندرجہ بالا رائے قدرے تلخ اور سخت ضرور ہے، لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان کی مذکورہ رائے غیر جانبدارانہ محاکے پر محمول کی جائے گی۔ انھوں نے مثنویات میر کے متون کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کے بعد ہی یہ رائے پیش کی ہے اور جب پوری ذمہ داری کے ساتھ وہ کوئی بات کہتے ہیں تو اس امر سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ ادبی حلقوں میں اس پر شدید ردعمل بھی ہوگا۔ اس کے باوجود وہ اپنے دل کی بات کو بہ زبان قلم بیاں کرنے سے گریز نہیں کرتے اور ہر ردعمل کا جواب دینے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہتے ہیں، کیونکہ ان کے نسبتاً تلخ خیالات منطقی دلائل پر مبنی ہوتے ہیں اور متون کا سنجیدہ مطالعہ ان کے اعتماد میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ جہاں کہیں بھی میر نے مثنویات میں شاعرانہ کمالات کے جوہر دکھائے ہیں، وہاں وہاب اشرفی نے صدق دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ مثنویات میر کی خوبیوں اور خامیوں کو واضح کرنے کے دوران وہ ہر مرحلے پر حق بہ جانب دکھائی دیتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مثنویات میر کا جائزہ لینے سے قبل مثنوی کے فن اور اس کے ارتقائی تسلسل پر بھی صراحت کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے، اور دکن و شمال کی بعض قدیم مثنویوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے، تاکہ پس منظر کی خاطر خواہ وضاحت ہو سکے اور اس روشنی میں ہم مثنویات میر کا مطالعہ کر سکیں۔ وہاب اشرفی نے میر کے ہمعصر مثنوی نگاروں سے تقابل کی گنجائش بھی نکالی ہے اور دکن و شمال کی بعض قدیم مثنویوں کے ساتھ ہی بعد کی اہم مثنویوں کا محاکمہ بھی پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب نہ صرف اپنے موضوع سے خاطر خواہ انصاف کرتی ہے، بلکہ مختلف سیاق و سباق میں مثنویات میر کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں مجبور بھی کرتی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ''مثنوی اور مثنویات'' ہے، جس میں وہاب اشرفی نے اردو کی معروف مثنویات کے ساتھ ہی غیر معروف مثنویات کے متعلق بھی بنیادی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ جن مثنویات کے متعلق وافر مواد دستیاب ہے، ان پر تفصیل سے لکھنے کے بجائے انھوں نے اختصار سے کام لیا ہے اور جو مثنویات پردۂ خفا میں ہیں، اور جن کے متعلق بیشتر لوگوں کو سرسری معلومات بھی نہیں ہیں، ان کے متعلق وہاب اشرفی نے کافی کچھ معلومات فراہم کر دی ہیں۔ انھوں نے عمومی باتوں کو دہرانے سے اجتناب برتا ہے اور اجتہادی ذہن کے سہارے بعض نئی باتیں کہنے میں دلچسپی دکھائی ہے جو پڑھنے والوں کو چونکاتی ہیں۔ اردو کے معروف مثنوی نگاروں میں نظامی، ملا وجہی، غواصی، ابن نشاطی، مقیمی، ہاشمی، افضل اور سراج وغیرہ کا ذکر ہوتا رہا ہے، لہٰذا

ان کی مثنویات سے متعلق وہاب اشرفی نے تفصیل سے نہیں لکھا ہے، لیکن جو مثنوی نگار اردو شاعری کی تاریخ میں بہت حد تک گمنام رہے ہیں، انہیں بہ طور خاص اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً فائز، صنعتی، وجدی، روشن، علی، عزلت، غلام قادر شاہ اور مراد شاہ لاہوری وغیرہ۔ ان مثنوی نگاروں کی مثنویات کو محققوں اور ناقدوں نے زیادہ اہمیت نہیں دی اور بہت حد تک ان سے بے اعتنائی برتی۔ اس لحاظ سے وہاب اشرفی کی یہ تنقیدی کاوش تحقیقی سطح پر بھی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ مثنویات کے ضمن میں انھوں نے شاعری کی جملہ خصوصیات کو بہ طور خاص اہمیت دی اور یہ بتایا ہے کہ ناول کے فارم سے بہت حد تک مماثلت کے باوجود مثنوی کے فن میں شاعر کی فنکارانہ مہارت ہی اسے اعتبار کا درجہ عطا کرتی ہے۔ یعنی کامیابی کے ساتھ محض قصے کا بیان ہی مثنوی کو وقیع نہیں بناتا، بلکہ واقعات کی شاعرانہ ہنرمندی اس کی ادبی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔

''کاشف الحقائق''، امداد امام اثر کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے جسے وہاب اشرفی نے تدوین کے جدید اصولوں کی روشنی میں مدون کیا ہے اور ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''کاشف الحقائق'' ایک عرصے سے نایاب تھی۔ ترقی اردو بیورو، حکومت ہند کے زیر اہتمام ۱۹۸۲ء میں وہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر جب شائقین ادب کے ہاتھوں میں پہنچی تبھی لوگ اس کی وقعت اور عالمانہ شان سے صحیح طور پر واقف ہوئے اور وہاب اشرفی کے بھرپور مقدمے نے اس ضمن میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ''کاشف الحقائق'' کو اردو تنقید کا نقش اول کہا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ کتاب حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے قبل لکھی گئی تھی، لیکن افسوس کہ اس اہم کتاب کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور ادبی حلقوں میں اس کا ذکر برائے نام ہی رہا۔ وہاب اشرفی نے اپنے طویل مقدمے میں مناسب دلیلوں کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کاشف الحقائق میں امداد امام اثر نے بعض ادبی مباحث، حالی سے زیادہ واضح انداز میں پیش کیے ہیں۔ مثلاً شاعری کے ذیل میں اثر کے خیالات حالی سے زیادہ مدلل، منطقی اور اثر انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تجربے اور الفاظ دونوں کے متعلق اثر نے زیادہ صراحت کے ساتھ کاشف الحقائق میں بیان کیا ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنے طویل مقدمے میں اس بات کی جانب بہ طور خاص توجہ دلائی ہے کہ امداد امام اثر کا ذہن قاموسی تھا۔ کئی ترقی یافتہ زبانوں پر انہیں بھرپور دسترس حاصل تھی اور یہی وجہ ہے کہ عالمی ادب کے تناظر میں انہوں نے شعر و ادب کے بنیادی مفروضات کو پرکھنے کی کوشش کی۔ وہاب اشرفی کے مطابق، امداد امام اثر کی تحریروں

میں تقابلی طریقہ کار کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں، جن سے ادب کے تئیں ان کے واضح نقطۂ نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنے مقدمے میں بجا طور پر اس حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ادبی حلقوں میں طویل عرصے تک امداد امام اثر کو نظرانداز کرنے کی فاش غلطی کی جاتی رہی اور بدقسمتی سے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اردو تنقید کے ارتقائی سفر میں محض حوالے کے طور پر اثر کا ذکر شاید ہو جائے، لیکن علیحدہ طور پر ان کے افکار و نظریات کا جائزہ لینا کسی کو منظور نہیں۔ جن لوگوں کے حوالے سے گفتگو کا چلن عام ہے، دراصل انھیں ہی گفتگو کا موضوع بنانا لوگوں کو مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امداد امام اثر کی شخصیت اور اس کی تصنیف ''کاشف الحقائق'' کو وہ قدر و منزلت حاصل نہ ہو سکی، جس کی وہ حقدار تھی۔ بہرحال وہاب اشرفی نے ادبی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے امداد امام اثر کے افکار و نظریات کا نہ صرف بہترین تجزیہ کیا ہے بلکہ جابجا ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس عمل میں وہ صرف اس بنا پر کامیاب ہو پائے ہیں کیونکہ ترقی یافتہ زبانوں کا ادب اور کسوٹی کے متعدد پیمانوں سے وہ خود بھی خاطر خواہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ہرچند کہ وہاب اشرفی نے اپنے مقدمے میں ''کاشف الحقائق'' کا بھرپور تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے باوجود انھیں اس بات کا احساس ہے کہ تنقید کی یہ بے حد اہم کتاب اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تجزیے کا عمل مسلسل جاری رہے۔ امداد امام اثر نے مغربی ادب سے بعض افکار و نظریات مستعار ضرور لئے، لیکن انھیں اردو میں پہلی مرتبہ پیش کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ مشرقی ادب اور نظریے کے حوالے سے گفتگو کی جائے۔ مثلاً اردو میں قطعیت اور معروضیت کی بحث سب سے پہلے کاشف الحقائق میں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہاب اشرفی کے لفظوں میں

> ''Subjective اور Objective شاعری کی یہ بحث امداد امام اثر کی اوّلیات میں سے ہے۔ اس سے پہلے شاعری کی ان دو واضح قسموں پر اردو میں کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ شاعری کی یہ بنیادیں یا سطحیں آج کی تنقید کی واضح جولان گاہ ہے۔ امداد امام اثر نے جو کچھ کہا ہے، وہ سرسری ہے اور جس قسم سے موضوعات تقسیم کر دیئے ہیں وہ بھی آج قابل اعتبار نہیں ہیں، پھر بھی اتنی بات تو واضح ہے کہ داخلی اور خارجی شاعری کی گفتگو آج انتہائی گہرائی اور پیچیدگی کی سطح کو چھو چکی ہے''۔

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہاب اشرفی، تنقیدی رائے کے سلسلے میں پوری دیانت داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ انھوں نے جہاں امداد امام اثر کے خیالات کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، وہیں مثبت پہلوؤں کو تحسین کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ ''کاشف الحقائق'' کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کے لئے بعد میں وہاب اشرفی نے ایک کتاب اور لکھی جو کہ پہلی کتاب کی توسیع کہی جاسکتی ہے۔

اپنے ہم عصروں کے متعلق اظہار خیال بے حد پیچیدہ مرحلہ ہے، کیونکہ اس عمل میں چاہتے ہوئے بھی غیر جانداری نہیں برتی جاسکتی ہے۔ وہاب اشرفی بھی اس آزمائش سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب ''سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے'' کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بے باک قلم اپنے ہم عصر لیکن بزرگ ساتھی کی دفاع میں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ وہاب اشرفی نے افسانہ نگاری کے ذریعے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی تھی اور اس ضمن میں بہ طور خاص سہیل عظیم آبادی کی صحبتوں نے اس شوق کو جلا بخشا تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسا فن کار جو کسی نہ کسی حوالے سے ایک آئیڈیل کا درجہ رکھتا ہو، اس کے متعلق بے باکی کے ساتھ کچھ لکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس کتاب میں یہ مشکل دیکھی جاسکتی ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنی دیگر تنقیدی کتابوں میں حس بے باکی کے ساتھ اپنے غیر جانبدارانہ خیالات کی پیشکش میں دلچسپی دکھائی ہے، وہ بے باکی اور غیر جانبداری اس کتاب میں کم کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ البتہ فن افسانہ نگاری سے ان کی جذباتی اور دیرینہ وابستگی تجزیے سے واضح ہو جاتی ہے۔ انھوں نے دلچسپی کے ساتھ سہیل عظیم آبادی کے نمائندہ افسانوں کا تجزیہ کیا ہے، جن میں الاؤ، جینے کے لیے، سادھو اور سیوا، اسٹیشن پر، عجائب خاں، بھابھی جان، دل کا کانٹا، گرم راکھ اور بدصورت لڑکی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے وہاب اشرفی نے متن کی روح میں اترنے کی کوشش کی ہے اور مختلف سیاق وسباق میں ان کے بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے مختلف مثالوں کے ذریعے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سہیل عظیم آبادی کا فن، پریم چند کے فن سے کئی معنوں میں مختلف تھا۔ عام طور پر سہیل عظیم آبادی کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ انھوں نے پریم چند کی تقلید کی، اور اس حوالے سے افسانے کی دنیا میں ان کی ایک پہچان ہے۔ وہاب اشرفی نے اس عمومی رائے سے اختلاف کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ سہیل عظیم آبادی، پریم چند کی طرح آدرش وادی نہیں تھے، انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو پوری شدت کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اور زندگی جس طرح پل پل نت نئے روپ اختیار

کرتی ہے، وہ تبدیلی، سہیل کے یہاں معنویت کی نئی جہتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کی شخصیت اور ان کے افسانوں کی تفہیم میں وہاب اشرفی کی یہ کتاب بنیادی حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔

''پطرس اور ان کے مضامین''، نصابی ضرورتوں کے پیش نظر تصنیف کی گئی ہے۔ وہاب اشرفی نے مضامین پطرس کے حوالے سے ایک مقدمہ لکھا ہے جن میں تمام مضامین سے متعلق بنیادی باتوں کو پیش کیا ہے۔ طلبہ کے لئے یہ باتیں کارآمد اور مفید ہیں، لیکن علمی سطح پر ان میں گفتگو کی زیادہ گنجائش نہیں۔ وہاب اشرفی نے طنز اور مزاح کا فرق واضح کرتے ہوئے پطرس کو ایک مزاح نگار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعات کے پر تکلف بیان میں پطرس کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اگر اس کتاب میں مزاح نگاری کے ارتقائی سفر کا مختصر جائزہ ہوتا اور بعد کے مزاح نگاروں سے پطرس کے تقابل کی کوئی صورت نکلتی تو یہ کتاب اپنے موضوع سے زیادہ انصاف کرتی۔

''راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری'' ایک مختصر کتاب ہے جس میں وہاب اشرفی نے بیدی کے مشہور افسانوی مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہاب اشرفی کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کی یہ کاوش بیدی کے مجموعی کمالات کا احاطہ نہیں کرتی۔ انھوں نے بیدی کے محض چند افسانوں کو بنیاد بنا کر گفتگو کی ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض اہم نکتوں کو واضح کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ افسانے کا عمومی تجزیہ کرنے کے بجائے انھوں نے کہانی کی روح میں اترنے کی کوشش کی تھی اور کرداروں کے نفسیاتی پس منظر کو بہ طور خاص اجاگر کیا ہے، جس کی بنا پر بیدی کے افسانوں میں مفاہیم کے نئے زاویوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ ابتداء میں وہاب اشرفی نے ''اردو افسانے کی روایت'' کے عنوان سے ایک بھرپور مضمون قلمبند کیا ہے جس میں اردو افسانے کے ابتدائی خدوخال واضح کرتے ہوئے عہد بہ عہد نمائندہ فن کاروں کا حوالہ دیا ہے۔ اس ضمن میں پیش رو فن کاروں کی انفرادی خصوصیات، فنی خامیوں کے ساتھ بیان ہوئی ہیں اور اس روشنی میں بیدی کے فن کو جانچنے کی سعی کی گئی ہے۔ بیدی کے ہم عصروں سے ان کا تقابل بھی کیا گیا ہے اور بعد کے فنکاروں پر بیدی کے اثرات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم مضمون ''راجندر سنگھ بیدی کا فنی شعور'' میں وہاب اشرفی نے بحیثیت فن کار بیدی کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا فن دو کلیدی پہلوؤں غم اور جنس کے ارد گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ بیدی کے افسانوں پر گفتگو کے دوران ہمیں

ان دو پہلوؤں کو بطور خاص ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے تبھی ہم بیدی کے فنی شعور کو بہتر طریقے سے اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں وہاب اشرفی کے یہ جملے ملاحظہ ہوں

''بیدی، غم کے ماروں کی طرح Nihilist نہیں بنتے۔ زندگی کی تحریک اور اس کی اثباتیت ان کے یہاں موجود ہے، لیکن حرکت و اثبات کے عمل میں جو دکھ درد سامنے آتے ہیں، وہ انھیں سمیٹنے پر قادر ہیں۔ یہی ان کا امتیاز ہے اور شاید پہچان بھی''۔

غم کے تعلق سے وہاب اشرفی کی یہ بات بیدی کے فن میں جنس کے حوالے سے بھی بیان کی جاسکتی ہے۔ بیدی کے فن میں جنس کی زیریں لہروں کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ لہریں غالب رجحان کی حیثیت سے ہمارے محسوسات کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ وہاب اشرفی نے اپنے تجزیے میں اس نوعیت کے باریک نکتے اجاگر کرتے ہوئے اپنی تنقیدی بصیرت کا جابجا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے افسانوی مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کے تمام افسانوں کا الگ الگ تجزیہ کیا ہے اور اس ضمن میں عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے بیدی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں مغربی ادب کے نمائندہ فن کاروں کا حوالہ دیا ہے، وہیں نفسیات کی بعض اصطلاحوں کا بھی سہارا لیا ہے تاکہ وسیع تناظر میں تفہیم بیدی کی راہ ہموار ہوسکے۔

قابل ذکر نقاد وہی ہوتا ہے جو کسی حصار میں اپنے آپ کو مقید نہیں رکھتا۔ وہاب اشرفی کا خاص میدان اگرچہ فکشن رہا ہے، لیکن انھوں نے ادب کی مجموعی صورت حال کا جائزہ لینے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ ''تفہیم البلاغت'' ایک ایسی ہی کوشش ہے جس میں شاعری کی فنی اصطلاحات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب خالص تدریسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے تاکہ طلبہ کے مسائل کو حل کیا جاسکے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہاب اشرفی نے صنعتوں کی وضاحت میں نسبتاً آسان زبان استعمال کی ہے اور مثالیں دیتے وقت مشکل اشعار سے پرہیز کیا ہے۔ علم بیان سے متعلق کارآمد گفتگو بھی کتاب میں شامل ہے۔

''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر'' کے مطالعے سے وہاب اشرفی کے تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک نقاد جب تک تحقیق کے بنیادی اصولوں سے کماحقہ واقف نہ ہو، وہ اپنی تنقید کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ متنازعہ فیہ باتوں کی صداقت سے اگر وہ براہ راست آگاہ نہیں ہے تو وہ فطری طور پر سنی سنائی باتوں پر ایمان لائے گا اور اسی بنا پر اپنے تنقیدی مفروضات پیش کرے گا جو

کہ اثر پذیری کی صلاحیت سے محروم ہوں گے۔ وہاب اشرفی ان باتوں سے پوری طرح باخبر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں تحقیقی مزاج کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کی نثر کا تجزیہ دراصل وہاب اشرفی کی تحقیقی کاوش ہے جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ عام طور پر پی ایچ ڈی کے مقالے صرف ڈگریوں کے لئے لکھے جاتے ہیں، بلکہ ترتیب دیے جاتے ہیں، اور انہیں اشاعت کی منزلوں سے گزرنا نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن قابل ذکر لوگوں کی تحقیقی کاوشیں ان کی بنیادی شناخت ہوتی ہیں۔ وہاب اشرفی کی یہ کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے۔ انھوں نے شاد عظیم آبادی کی نثری خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحقیق کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ شاد کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے، لیکن وہاب اشرفی نے تحقیق کے لئے ان کی نثری خدمات کا جائزہ لینا مناسب سمجھا اور ادبی دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی بھی متنازعہ فیہ بات کو منطقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاد کی نثری تصانیف میں صورت الخیال، نوائے وطن، صورت حال، انیونی، فکر بلیغ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام تصانیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف مزاج اور معیار کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''صورت الخیال'' ایک ناول ہے، جو شاد کے لفظوں میں ان کا طبع زاد ناول ہے، لیکن وہاب اشرفی نے مختلف شواہد اور مثالوں کے ذریعے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''صورت الخیال'' شاد کی اوریجنل کہانی نہیں ہے، بلکہ اس میں بنگلہ ناول ''اندرا'' کے کافی کچھ اثرات ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شاد عظیم آبادی کی کتاب ''نوائے وطن'' جب شائع ہوئی تو اس پر بہت ہنگامہ ہوا۔ دراصل اس کتاب میں انھوں نے جذبہ اصلاح زبان کو معروضی انداز میں پیش کیا تھا۔ لیکن عظیم آباد سے لے کر دہلی تک اس کے خلاف ایک محاذ کھڑا کیا گیا اور ان کی زبان دانی پر شدید حملے کئے گئے۔ اپنی دفاع میں شاد کو ''اپیچ'' نام کا ایک رسالہ بھی شائع کرنا پڑا، جس میں وہ تمام اعتراضات کا جواب دیا کرتے تھے۔ وہاب اشرفی نے شاد کے دو اور ناولوں ''صورت حال'' اور ''افیونی'' کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی ناول نگاری کے خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاد کو انھوں نے اصلاح پسند ناول نگار کہا ہے اور اسی تناظر میں ان کے فنی شعور پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ شاد کے حوالے سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تمام مواد ان کے پیش نگاہ رہے ہیں اور کوئی بھی رائے قائم کرتے ہوئے انھوں نے بنیادی متن سے رجوع کیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ شاد کی تذکرہ نگاری، تاریخ نویسی اور زبان و ادب کے حوالے سے ایک مبسوط فکر کا علم بھی ہوتا ہے اور یہ تمام باتیں مدلل انداز میں کہی گئی ہیں۔ قاضی عبدالودود جیسے بلند پایہ محقق نے اس کتاب کو بہ نظر تحسین دیکھا اور سند کے طور پر اپنی بیش قیمتی

رائے سے نوازا۔

''آ گہی کا منظر نامہ'' وہاب اشرفی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ انھوں نے الگ الگ موضوعات پر مضامین لکھنے اور پھر انھیں تنقیدی مجموعے کی صورت میں شائع کرانے میں دلچسپی نہیں لی اور خاص موضوع کا انتخاب کر کے باقاعدہ کتاب لکھنے کو زیادہ اہمیت دی۔ ویسے ''آ گہی کا منظر نامہ'' اپنے مشمولات کے اعتبار سے حاصہ وقیع کہا جا سکتا ہے، لیکن اس میں غور وخوص کے بعد ادب کے حوالے سے بعض اہم سوالات قائم کئے گئے ہیں۔ نئے نئے مضامین کے ذریعہ لسانی اور ادبی مباحث کو سامنے لانا اور اس پر غور وفکر کے لئے مجبور کرنا بذات خود ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر مضامین میں وہاب اشرفی کا رویہ قدرے سخت اور جارحانہ معلوم ہوتا ہے۔ خاص کر ہم عصر تنقید نگاروں کے حوالے سے ان کے تاثرات کا بیان شدت اختیار کر لیتا ہے۔ انھوں نے نظری تعصبات سے بلند ہو کر کھرے کھوٹے کی شناخت کے جو پیمانے وضع کئے ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے ان کی بے باکی اور حق گوئی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس تنقیدی مجموعے کے ابتدائی تین مضامین تحقیق اور تنقید کے بعض تشنہ لیکن اہم گوشوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان مضامیں کے ذریعے وہاب اشرفی نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے اور اس بنیادی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ورنہ تفہیم ادب کی کوئی بھی کاوش بامعنی اور کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔ ''کلام اقبال کے نثری معانی'' اس مجموعے کا ایک اہم مضمون ہے، جس میں وہاب اشرفی نے استدلالی طریقہ کار کے سہارے اس اچھوتے خیال کو پیش کیا ہے کہ شاعری کے نثری مفاہیم تک رسائی کسی اعتبار سے مستحسن عمل نہیں، کیونکہ شاعری اور نثر میں بنیادی فرق ہے اور نثری وسیلے سے ہم شعری مفہوم کے ساتھ انصاف ہی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے بہ طور خاص کلام اقبال کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے اور اس تلخ حقیقت سے آگاہ کرایا ہے کہ صحیح تناظر میں کلام اقبال کو نہ سمجھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ کبھی انہیں فاشسٹ، کبھی رجعت پسند اور کبھی پیامبر سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ وہاب اشرفی نے شاعری کے نثری معانی تک پہنچنے کی کوشش کی سخت تنقید کی ہے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں

> ''میرا خیال ہے کہ شاعری کے نثری معانی تک پہنچنے کی کوشش ایک فعل عبث ہے اور نثری معانی کی بنیادوں پر کسی شاعری کی عظمت کا فیصلہ غیر مستحسن بھی ہے اور غلط بھی۔ نثر کے تقاضے اور ہیں، شاعری کے اور۔ ان کی کارکردگی بھی قطعی مختلف ہے۔ ایسی صورت میں یہ

بات واضح ہے کہ شعر، نثر اسی وقت بن سکتا ہے، جب وہ اپنے
مخصوص تقاضے سے دست بردار ہو جائے اور مخصوص کارکردگی کو
بالائے طاق رکھ دے۔ نثر کی غایت محض مفہوم کی اکہری ترسیل ہے،
جب کہ شاعری پیچیدہ اور تجریدی عوامل کا نتیجہ ہے''۔

اسی نظریے کی روشنی میں وہاب اشرفی نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے اور نسبتاً نئے تناظر میں تفہیم اقبال کے امکانات روشن کئے ہیں۔ ''اردو میں دانشوری'' کے علاوہ جمیل مظہری اور غیاث احمد گدی کے فنی شعور کا احاطہ اس مجموعے کے وقار میں اضافہ کرتا ہے۔

''اردو فکشن اور تیسری آنکھ'' وہاب اشرفی کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے، جس میں شامل مضامین فکشن سے متعلق ان کے انفرادی نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے اردو فکشن کے بنیاد گزاروں کے ساتھ موجودہ عہد کے فنکاروں کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کسی بھی نوعیت کی رائے قائم کرنے کے دوران تقابلی طریقۂ کار ہمیشہ ہی ان کے پیش نظر رہا ہے۔ اس سا پر ان کی تنقید ایک منفرد جوار رکھتی ہے۔ فکشن سے متعلق ان کا یہ خیال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ فن پارے کی بہتر تفہیم مختلف سیاق وسباق میں ہی ممکن ہے۔ جب تک فن پارے کی روح میں اترنے کی کوشش نہ کی جائے، تفہیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ وہاب اشرفی نے انھیں اصولوں کی روشنی میں مختلف عہد کے فکشن نگاروں کی تخلیقات کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند، منٹو اور قرۃ العین حیدر کے ساتھ ہی انھوں نے غیاث احمد گدی، جوگیندر پال، منظر کاظمی اور عبدالصمد وغیرہ کے فکشن کو بھی اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ شاد عظیم آبادی اور اختر اورینوی کی ناول نگاری کا جائزہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ وہاب اشرفی نے اس مجموعے میں بعض ایسے موضوعات کو بھی اظہار خیال کا موضوع بنایا ہے جن کا ذکر کرنا سربرآوردہ نقاد اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ شعروادب کی تفہیم کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے دیباچے میں بہت بنیادی بات کہی ہے

''میرا اصرار کل بھی تھا اور آج بھی ہے کہ ادب مماثلتوں کی تلاش کا
فن ہے۔ یہ فن اسی وقت بالیدہ ہوتا اور نکھرتا ہے جب کوئی تخلیق
جمالیاتی احساس سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ موضوعات کی کثرت میں،
کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا انتخاب بذات خود کوئی خاص بات نہیں
ہے۔ بات تب خاص ہو جاتی ہے جب فنکار کا احساس جمال اسے
جلا بخشتا ہے، ورنہ موضوع اپنے آپ میں محترم نہیں، نہ ہی چھوٹے

اور بڑے موضوع کی تفریق کسی ادب پارے کے چھوٹے یا بڑے
ہونے کی شہادت ہے"۔

ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام "ہندوستانی ادب کے معمار" سیریز کے تحت وہاب اشرفی نے مجروح سلطان پوری پر ایک مونوگراف بھی لکھا ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ اور اہم ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مجروح کی شاعری کے ساتھ ہی ساتھ فلمی نغمہ نگاری کا جائزہ بھی لیا ہے۔ مجروح کا ادبی سرمایہ بے حد مختصر ہے۔ "غزل" ان کا اولین مجموعۂ کلام ہے، جس کے متعدد ایڈیشن مختلف وقتوں میں شائع ہوتے رہے۔ مجروح نے بعد میں اسی مجموعے کو برائے نام اضافے کے ساتھ "مشعل جاں" کے نام سے شائع کیا، لہٰذا اس بات کا مغالطہ نہیں رہنا چاہیے کہ "مشعل جاں"، مجروح کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ وہاب اشرفی نے اس پہلو کو واضح کرتے ہوئے مجروح کا ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور انھیں ترقی پسند اردو غزل کا ایک معتبر دستخط قرار دیا ہے۔ وہاب اشرفی نے بہ طور خاص اس حقیقت کا بیان کیا ہے کہ مجروح نے ایک ایسے عہد میں غزل کی آبرو برقرار رکھی جب غزل پر بہت سخت وقت آن پڑا تھا۔

"مابعد جدیدیت ممکنات و مضمرات" عصری تقاضوں کے تحت لکھی گئی کتاب ہے جس میں وہاب اشرفی نے مابعد جدیدیت کی گتھی سلجھانے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مابعد جدیدیت، دراصل پیمائش ادب کا ایک آلۂ کار ہے، جس کے ذریعہ قدیم وجدید، کسی بھی فن پارے کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں عملی نمونے بھی پیش کیے ہیں اور اردو کی کلاسیکی شاعری کے ساتھ ہی ہم عصر اردو شاعری پر اس آلۂ کار کا اطلاق کیا ہے۔ نثر بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا ہے۔ اردو فکشن اور تنقید کو بھی انھوں نے پیش نظر رکھا ہے اور دلائل کی روشنی میں بعض مفروضات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کی یہ کاوش تفہیم ادب کے ضمن میں کس حد تک کارگر ثابت ہوگی، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ اردو ادب میں ہمیشہ سے ہی مغربی خیالات کی یورش دیکھنے کو ملتی رہی ہے۔ بڑے طمطراق کے ساتھ نئے خیالات و نظریات کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، اور بھرپور دلائل کے ساتھ اپنے ادب میں اسے منطبق کیا جاتا ہے۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ہی رفتہ رفتہ نئے نظریات سے ہم ذہنی طور پر ہم آہنگ ہو پاتے ہیں۔ وہاب اشرفی کی یہ کتاب اسی تناظر میں دیکھی جانی چاہیے۔

وہاب اشرفی بہ یک وقت کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں، جن کی بنا پر مشرق و مغرب کی بہترین ادبیات اور انھیں پرکھنے کے لئے معیاری اصول نقد سے انھیں خاطر خواہ واقفیت ہے۔

اردو کے تخلیقی فن پاروں اور تنقیدی کاوشوں کا جائزہ لیتے وقت معیاری ادبیات کے نمونوں اور تنقید کے آفاقی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہیں اور انھیں کی روشنی میں اپنے خیالات کو تحریری شکل میں پیش کرتے ہیں۔ 'تاریخ ادبیات عالم' کی سیریز ان کے قاموسی ذہن کا پتہ دیتی ہے۔ اب تک سات جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جن میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے نمائندہ ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یقیناً وہاب اشرفی نے انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، لیکن اس سے کتاب کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ انھوں نے متعلقہ تمام مواد کو پہلے اچھی طرح سمجھا ہے اور پھر اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی صورت میں دیگر زبانوں کا ادب بھی ہمارے لئے اجنبی نہیں رہ جاتا اور ہم بغیر کسی دشواری کے اس مخصوص زماں کے فن کاروں سے مانوس ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کا جائزہ لینا کس قدر جاں جوکھم کا کام ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ انگریزی میں بھی تاریخ ادبیات عالم کا احاطہ کرتی ہوئی مبسوط کتابیں نہیں جنھیں پیش نظر رکھا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ ادبی انسائیکلوپیڈیا بھی اس ضمن میں زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے بھی اپنے حدود ہیں۔ ایسی صورت میں قدیم متنوں کی حصولیابی ہی بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور اس ضمن میں وہاب اشرفی کو بلاشبہ حد درجہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ تاریخ ادبیات عالم کا جائزہ پیش کرنے سے قبل وہاب اشرفی کا ذہن متعدد سوالات کے نرغے میں رہا۔ انھوں نے مختلف زاویے سے اس مرکزی نکتے کو اپنی فکر کا محور بنایا کہ کیا تاریخ ادبیات عالم کو قلمبند کرنا ممکن بھی ہے؟ کسی ایک زبان کی تاریخ لکھنا بذات خود اپنے آپ میں جاں جوکھم کا کام ہے۔ مربوط انداز میں زبان و ادب کے ارتقائی تسلسل کو سمیٹنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ اس تناظر میں ہم دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ تاریخ ادبیات عالم کو سمیٹنا درحقیقت کوزے میں دریا کو سمیٹنے کے مترادف ہے۔ وہاب اشرفی خود بھی اس سوال سے دوچار ہوئے ہیں کہ تاریخ ادبیات کو قلمبند کر کے کیا واقعی کوزے میں دریا کو سمیٹا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق بہ ظاہر اس سوال کا جواب نفی میں دیا جا سکتا ہے، لیکن پھر فوراً ہی ان کا ذہن ایک اہم سوال اور بنیادی سوال کی جانب منعطف ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں تو تاریخ ادبیات عالم سے واقف ہی نہیں ہوا جا سکتا۔ اس سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ

> ''مختلف قوموں اور ملکوں کے مرکزی ادبی دھاروں کو گرفت میں لینا بہر حال ممکن ہے، البتہ ضمنی مباحث کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ گویا گراں خیالات و تصورات کو سمیٹا جا سکتا ہے اور عالمی شعر و ادب کی

مکمل تصویر نہیں تو اس کی ایک جھلک ضرور دیکھی اور دکھائی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک جھلک نہ صرف مسلسل اور مکمل جلوے پر اکسائی رہے گی، بلکہ یہ ایک ایسی بنیاد بنے گی، جس پر حوصلہ مند، وسیع المطالعہ اور زیادہ فعال افراد خوشنما محل تعمیر کر سکیں''۔

تاریخ ادبیات عالم کی ورق گردانی، وہاب اشرفی کے اس دعوے کو درست ثابت کرتی ہے۔ انھوں نے اب تک شائع شدہ سات جلدوں میں مختلف قوموں اور ملکوں کے مرکزی دھاروں کو گرفت میں لینے کی جامع کوشش کی اور ضمنی مباحث کو زیادہ اہمیت نہیں دی، جس کی بنا پر قاری تاریخ ادبیات عالم کے گراں قدر خیالات وتصورات سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔ انھیں خود بھی اس بات کا احساس ہے کہ ان کی یہ کاوش مختلف ملکوں اور قوموں کے شعر و ادب کی مکمل تصویر نہیں، بلکہ محض اس کی ایک جھلک ہے، لیکن اس اعتراف میں بھی امکان کا یہ پہلو بہر حال شامل ہے کہ یہ جھلک پر کشش ہونے کے باعث مکمل جلوے کے لئے شیدائیوں کو ضرور اکسائے گی اور سنجیدہ حضرات اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے ضرور راغب ہوں گے۔ اس نوعیت کے کام اداروں کے ذریعے ہی انجام دیے جاتے ہیں، لیکن وہاب اشرفی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تن تنہا ہی اس مشکل کام کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا اور بہت حد تک اسے تکمیل کے مرحلے تک پہنچا بھی دیا۔

تاریخ ادبیات عالم کی پہلی جلد میں وہاب اشرفی نے مصری، اشوری، یونانی، چینی، لاطینی، عبرانی، کیلٹی، ہسپانوی، سنسکرت، پالی اور فرانسیسی ادبیات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ دوسری جلد میں پہلی جلد کی بعض ادبیات کو دوبارہ پیش کیا گیا ہے، مثلاً مصری، یونانی، لاطینی اور سنسکرت زبانوں کے ادب کا جائزہ دوسری جلد میں بھی موجود ہے، لیکن مطالعے کے بعد اس حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے کہ دونوں جلدوں میں ان مذکورہ زبانوں کے ادبیات کی تکرار قطعی نہیں، بلکہ دوسری جلد میں پہلی جلد کے بعض تشنہ پہلوؤں کو مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری جلد میں جرمن، امریکی، اسکینڈ نیویائی، فارسی اور تامل ادبیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان دونوں جلدوں میں قبل از مسیح کی ادبیات سے لے کر ۱۷ویں صدی تک کے زمانے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی جلدیں ۱۸ویں سے ۱۹ویں صدی تک کے ادبیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان جلدوں میں یونانی، اطالوی، فرانسیسی، کیلٹی، سنسکرت، ڈنمارک، اسکاچستان، روسی، جرمن، سویڈی، پرتگالی، ڈچ، تامل، پنجابی، مراٹھی اور بنگالی ادبیات کی تاریخی جھلک دکھائی گئی ہے۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ چند غیر ملکی زبانیں مثلاً عربی و فارسی کی تاریخ ادبیات ان جلدوں میں شریک اشاعت نہیں ہے۔ پانچویں جلد میں یونانی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی، عبرانی، ہندی اور اردو ادبیات کی مختصر تاریخ پیش کی گئی ہے، جب کہ چھٹی جلد میں روسی، بنگلہ، ترکی، تامل، مراٹھی، ملیالم، فارسی اور اردو کی ادبیات کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں اور چھٹی جلد میں حالانکہ اردو زبان وادب کی مختصر تاریخ درج کی گئی ہے، لیکن وہاب اشرفی اردو کے حوالے سے ایک علیحدہ اور مکمل جلد شائع کرنا چاہتے ہیں، تاکہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں اور ان کی ادبیات کے تناظر میں اردو زبان وادب کی مختصر تاریخ کا تقابل کیا جاسکے۔

تاریخ ادبیات عالم کا جائزہ لینے کے دوران وہاب اشرفی نے بعض قدروں اور انسانی ذہن کی مخصوص ساخت کو تخلیقیت کے پیش نظر مشترک پایا اور یہ بات انھیں حیرت میں ڈالتی رہی کہ مختلف جغرافیائی حدود میں رہنے والی آبادیاں ذہنی اور فکری اعتبار سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "جواں مردی، وفور جذبات، جنگ و جدال، صلح و آشتی، مردوزن کے ازلی قصے، شکست و فتح، شادمانی و حرماں نصیبی وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو تمام ادبیات میں مشترکہ اثاثہ کی حیثیت رکھتی ہیں"۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادبیات عالم کی تاریخ ایک بھرپور تقابلی مطالعے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ وہاب اشرفی نے تاریخ ادبیات عالم کو قلمبند کرنے کے دوران اس بنیادی پہلو کو بہ طور خاص ذہن میں رکھا ہے اور اس حوالے سے بہترین نمونے بھی پیش کئے ہیں، لیکن بے حد وسیع موضوع کے پیش نظر اس ضمن میں اظہار خیال کی زیادہ گنجائش نہیں نکال پائے۔ ویسے یہ موضوع اپنی نوعیت کی بنا پر آئندہ لوگوں کو سنجیدہ کام کرنے کی ترغیب ضرور دے گا۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہاب اشرفی کی فکری کائنات کافی وسیع ہے۔ وہ اپنی تنقیدی تحریروں کے سلسلے میں بے حد محتاط دکھائی دیتے ہیں اور غور و خوض کے بعد فن یا فن کار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں، تنقید برائے تنقید کے عیب سے پاک ہیں۔ انھوں نے بہت حد تک غیر جانبدار ہو کر بے باکی کے ساتھ اپنے موقف کو واضح کیا ہے۔ تنقید ان کے نزدیک ایک سنجیدہ عمل ہے اور اس کی وقعت کو برقرار رکھنے میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اپنی رائے کے استحکام میں انھوں نے مناسب دلیلیں پیش کی ہیں، جن سے اختلاف کی گنجائش تو نکلتی ہے، لیکن جسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے وسیع تناظر میں ادبی فن پاروں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ تفہیم ادب کا ایک تقابلی منظر نامہ تشکیل پاسکے۔ مشرقی اور مغربی معیار نقد کا خوبصورت امتزاج ان کی تنقیدی تحریروں کو اعتبار بخشتا ہے۔ وہاب اشرفی اپنی

کتاب ''معنی کی تلاش'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں

''میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کا وسیع مطالعہ ہی کسی نقاد کی نگارشات کو وقیع بنا سکتا ہے، ورنہ مقامی روایات کی زنجیر میں جکڑا ہوا پسماندہ ادب اسے ہمیشہ عظیم نظر آئے گا اور پھر اس کی رائے اور تجزیے کے نتیجے میں جو ادب پیدا ہوگا وہ بھی یقیناً گھٹیا اور بے وزن ہوگا۔ ایسی صورت میں مغربی شعر و ادب اور تنقید کی طرف بار بار مڑ کر دیکھنا کتنا ضروری ہے، سمجھنے کی بات ہے۔ مغرب سے استفادہ کرنے والے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کو مغرب زدہ، فیشن پرست وغیرہ کہنا نادانی ہے، یا احساس کمتری کا کھلا مظاہرہ''۔

اس اقتباس کے ذریعے وہاب اشرفی کا تنقیدی موقف پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ وہ ادب کے سلسلے میں آفاقی نظریے کے علمبردار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ محض ایک زبان سے آشنائی، نقاد کی راہوں میں متعدد دشواریاں پیدا کر سکتی ہے۔ صرف ایک زبان کے ذریعہ وہ اپنی تحریروں کو وقیع نہیں بنا سکتا۔ اس کے لیے دیگر ترقی یافتہ زبانوں سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔ تبھی اس کی باتوں میں وزن پیدا ہوگا۔ تبھی اس کی رائے اہمیت حاصل کر پائے گی۔ جب تک وہ دیگر زبانوں کے تخلیقی ادب اور معیار نقد سے آگاہ نہیں ہوگا، اپنے ادب کے حوالے سے مناسب اور مدلل رائے پیش نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ مغرب پرستی کو عیب تصوّر کرتے ہیں اور تنقید کے سلسلے میں مشرقی معیار نقد کی وکالت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اس ضمن میں وہاب اشرفی کا نظریہ قدرے مختلف ہے۔ وہ مشرقی معیار نقد کی اہمیت و افادیت کے منکر نہیں، لیکن مغربی معیار نقد کی وقعت کو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقامی روایت کی پاسداری ضرور ہونی چاہیے، لیکن ضرورت سے زیادہ اگر اس کے انطباق پر زور دیا گیا تو ادب کی مقصدیت صحیح تناظر میں واضح نہیں ہو پائے گی۔ جو لوگ مغربی ادب اور تنقید سے استفادہ کرنے پر ناک بھوں سکوڑتے ہیں اور مغرب زدہ و فیشن پرست کہہ کر ادیبوں اور نقادوں کی ہتک پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں، ایسے لوگ وہاب اشرفی کے نزدیک بنیادی طور پر نادان اور احساس کمتری کے شکار ہیں۔ انھوں نے واضح طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ ادب کو ایک بے حد سنجیدہ عمل سمجھتے ہیں اور جمالیات کی منطق کو دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ ''معنی کی تلاش''

کے دیباچے میں ہی وہ آگے لکھتے ہیں

> ''ادب کی ایک ہی منطق ہے اور وہ منطق ہے جمالیات کی۔ کوئی ایک موضوع اپنے آپ میں وقیع نہیں۔ فن کار کا احساس جمال اسے وقیع بنا دیتا ہے۔ اس لئے میری نگاہ میں کسی ادب پارے میں کیا کہا گیا ہے، اتنا اہم نہیں، جتنا '' کیسے کہا گیا ہے، اہم ہے''۔

لفظ و معنی کی بحث قدیم زمانے سے جاری و ساری ہے۔ بعض لوگ لفظ کی وقعت کو تسلیم کرتے ہیں، جب کہ بعض لوگ معنی اور مفہوم کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ موضوع اور اسلوب کے سلسلے میں وہاب اشرفی آخر الذکر اصطلاح کو اپنا تنقیدی موقف بناتے ہیں۔ وہ اسلوب کے معترف دکھائی دیتے ہیں۔ فن پارے کا موضوع ان کے نزدیک ثانوی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ تخلیقی فن کار نے متعلقہ موضوع کو پیش کرنے کے دوران تخلیقی کرشمہ سازیوں کے نمونے کس کامیابی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ وہ اس فکر کے ہمنوا دکھائی دیتے ہیں کہ موضوع نیا نہیں ہوتا، بلکہ فن کار کا اسلوب اسے معنویت کی متعدد جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ وہاب اشرفی کی تنقیدی تحریروں میں ہمیں ان کا تنقیدی موقف واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے فن پاروں کا تجزیہ کرنے کے دوران فن کاروں کے اسالیب کو بہ طور خاص ذہن میں رکھا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ موضوع کی عمومیت کے باوجود فن کار نے کس بنا پر اپنی انفرادیت اور تخصیص قائم کی ہے۔ وہ اس بات کو اپنی تنقیدی تحریروں میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فن کار نے اپنی منفرد آواز کے استحکام میں کتنی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں ادبی رجحانات سے براہ راست اثر پذیری اور وابستگی کی بات بھی سامنے آتی ہے۔ وہاب اشرفی ادبی رجحانات کی اہمیت اور ضرورت کو صدق دل سے تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ادبی رجحانات کی بدولت ہی ادب میں زندگی کی رمق پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ ادب کی روانی اور ایک قسم کی مخصوص لے جب تک جاری رہتی ہے، زندگی کے نشیب و فراز پوری شدت کے ساتھ تخلیقی فن پاروں میں محسوسات کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں اور وسیع تناظر میں ادب اپنا ارتقائی سفر طے کرتا ہے، لیکن جیسے ہی یہ روانی اور لے متاثر ہوتی ہے، ادب میں جمود شروع ہو جاتا ہے اور دراصل یہ بدعت اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاب اشرفی کی تنقیدی تحریروں کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نئے ادبی نظریات کو یکسر رد کر دینے کے بجائے سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور و خوض کی گنجائش نکالی ہے۔ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف

ہیں کہ نئے ادبی نظریات میں صرف اور صرف مثبت پہلو ہی شامل نہیں ہیں۔ ان کے بعض کمزور پہلو بھی ان کی نگاہ میں ہوتے ہیں اور ان پہلوؤں سے شعوری طور پر وہ صرف نظر بھی کرتے ہیں، لیکن نئے ادبی نظریات کے مثبت پہلوؤں سے خاطر خواہ استفادہ ان کا بنیادی وصف ہے۔ نئے اور کارگر تجربے ان کے نزدیک بے حد قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی بدولت ادب کو نئی زندگی ملتی ہے اور تخلیقی فن پاروں میں نئی قوت کا اضافہ ہوتا ہے۔

وہاب اشرفی نے ایک طرف جہاں جدید رویوں اور نظریوں کو اپنی تحریروں میں برتنے کی کوشش کی ہے، وہیں قدیم ادبی نظریے بھی پوری توانائی کے ساتھ ان کے تنقیدی دائرے کا حصہ بنتے ہیں۔ گویا کہ نظریات کے مابین قدامت اور جدت کی تفریق ان کے نزدیک بے معنی ہے۔ اگر ادب کا قدیم رجحان فن پارے کے تجزیہ و تفہیم میں کارگر ثابت ہوتا ہے تو حد درجہ قدیم ہونے کے باوجود نئے نظریے کی بدولت زیادہ اہم ہے۔ قدامت کی بنا پر کسی نظریے کو وہ فرسودہ قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح نئے نظریے کو محض جدت کی بنا پر ہرگز قابل اعتنا نہیں گردانتے۔ ان کے اخذ و استفادے کا رویہ خالص علمی اور بہت حد تک منطقی ہے۔

وہاب اشرفی نے اپنی تنقیدی تحریروں میں تکرار سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ انھوں نے محض گھسی پٹی باتوں کو دہرانے کی غلطی نہیں کی ہے اور اجتہادی ذہن کا ثبوت پیش کرنے میں دلچسپی دکھائی ہے۔ ادب کو نئے امکانات سے روشناس کرانا ان کا بنیادی مقصد رہا ہے اور اس مقصد کے حصول میں انھوں نے خاطر خواہ سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ نئی اور چونکانے والی بات پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے مناسب توجیہات بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ رویہ ان کی تحریروں کو اعتبار بخشتا ہے۔

فن اور فنکاروں کا تجزیہ کرنے کے دوران وہاب اشرفی متن کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اس بات سے غافل نہیں کہ کسی مخصوص فن کار اور فن پارے کے حوالے سے کیا کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اپنے تجزیے کے دوران وہ ماہرین کے خیالات سے خاطر خواہ استفادہ بھی کرتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ توجہ وہ بنیادی متن پر صرف کرتے ہیں۔ سنی سنائی باتوں پر ایمان لانا ان کا شیوہ نہیں۔ وہ متن کو بنیادی مآخذ تسلیم کرتے ہیں۔ متن کا بہ غور مطالعہ اچھوتے مفاہیم تک رسائی میں ان کی مدد کرتا ہے اور اس بنا پر وہ نسبتاً نئی اور اچھوتی بات کہنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مخصوص موضوع سے متعلق پیش رو ناقدین کے خیالات کو وہ قطعی نظر انداز نہیں کرتے، بلکہ ان خیالات کی روشنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی اپنی انفرادیت کس بنا پر قائم ہو پا

رہی ہے۔ گویا کہ دوسرے ناقدین کی آراء اس کے لئے رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے اور وہ بڑی فن کاری کے ساتھ اپنی ایک ڈگر متعین کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے اپنی تنقیدی تحریروں میں قدم قدم پر علمی دیانت داری کا ثبوت پیش کیا ہے، جہاں کہیں بھی پیش رو ناقدین کے خیالات سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، وہاں کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے اور جہاں کہیں بھی اختلاف کی گنجائش دکھائی دی ہے، وہاں اپنے اعتراضات پیش کرنے میں کوئی جھجک نہیں دکھائی۔

''کتاب نما'' کے اس مخصوص نمبر میں شامل مختلف مضامین وہاب اشرفی کی ناقدانہ شناخت کو صحیح تناظر میں واضح کرتے ہیں۔ موجودہ عہد کے ایک اہم ناقد پر لکھتے ہوئے بیشتر لوگوں نے غیر جانبدارانہ محاسبے کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ جہاں بھی وہاب اشرفی سے لغزشیں ہوئی ہیں، مضمون نگاروں نے اپنی تحریروں میں انھیں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ان کی تنقید کے مثبت پہلوؤں کو بہ نظر تحسین بھی دیکھا ہے۔ اس نمبر میں شامل تمام مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں اور بحیثیت نقاد وہاب اشرفی کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔

راشد انور راشد
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

پروفیسر وہاب اشرفی
(سوانحی خاکہ)

نام	سید عبدالوہاب اشرفی
قلمی نام	وہاب اشرفی
تاریخ پیدائش	۲ر جون ۱۹۳۶ء (بہ اعتبار میٹرک سرٹیفکیٹ)
مقام پیدائش	موضع بی بی پور (کاکو)، ضلع جہان آباد، صوبہ بہار
خاندان	سلسلۂ اسلاف حضرت تاج فقیہہ اور ان سے آگے۔
وطن	بی بی پور (کاکو)
دادا	سید شاہ سلطان احمد اشرف
والد کا اسم گرامی	سید شاہ حاجی امام الدین
وفات	۱۹۵۸ء تدفین موضع بی بی پور، کاکو (جہاں آباد)
والدہ کا اسم گرامی	سیدہ تسلیما
وفات	۱۵ر اگست ۱۹۸۷ء تدفین موضع بی بی پور، کاکو (جہان آباد)
تعلیم	ایم اے (انگریزی)، ایم اے (اردو)، ایم اے (فارسی)، بی ایل، پی ایچ ڈی (اردو)

- ابتدائی تعلیم گاؤں بی بی پور میں ہی مولوی یعقوب صاحب (رشتہ دار بھی تھے) کی نگرانی میں ہوئی۔ کم عمری میں ہی ناظرہ قرآن مکمل کرلیا۔ اردو، فارسی کی ابتدائی کتابیں ''گلستان''، ''بوستان''، ''سخۂ تعلیمہ'' وغیرہ بھی پڑھ لیں۔
- بعد ازاں کاکو مڈل اسکول میں کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے (پھر کلکتہ چلے گئے)
- کلکتہ میں بالترتیب اسلامیہ اسکول اور مدرسہ عالیہ سے دسویں درجے تک تعلیم

حاصل کی۔ (پھر ڈھاکہ چلے گئے)

- رحمت اللہ ہائی اسکول، ڈھاکہ سے ۱۹۵۱ء میں میٹرک کا امتحاں امتیار کے ساتھ پاس کیا۔
- قائد اعظم محمد علی جناح کالج، ڈھاکہ میں آئی کام میں داخلہ لے لیا۔ سیاسی حلفشار کے مدنظر بغیر امتحاں دیئے ہی (۱۹۵۲ء میں) کلکتہ واپس چلے آئے۔ یہاں آکر انہوں نے سیٹی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۴ء میں آئی اے پاس کر لیا۔
- ۱۹۵۶ء میں سنٹرل کالج، کلکتہ سے بی اے (انگریزی آنرس) کا امتحاں دیا اور امتیاری نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔
- کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے (Comparative philology) میں داخلہ لیا لیکن ملازمت کے سبب تعلیم مکمل نہیں کر پائے۔
- ۱۹۶۰ء میں بہار یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔
- ۱۹۶۲ء میں بہار یونیورسٹی سے ہی ایم اے (اردو) کا امتحاں پاس کیا۔ فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔
- ۱۹۶۴ء میں بہار یونیورسٹی سے فارسی ایم اے کا امتحان بھی دیا اور فرسٹ کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے طلائی تمغہ پایا۔
- ۱۹۶۴ء میں، بہار یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، دہلی کی جانب سے وظیفہ ملنے لگا اور انہوں نے باقاعدہ ڈاکٹر اختر قادری، صدر شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور کی نگرانی میں تحقیق کا کام شروع کر دیا۔
- ۱۹۶۹ء میں B L کے دونوں حصّے بہار یونیورسٹی سے پاس کئے، لیکن کبھی وکالت نہیں کی۔

قابل ذکر اساتذہ: پروفیسر فرید پربتی، اختر قادری، پروفیسر شاہ مقبول احمد، بیخود کلکتوی، پروفیسر بیار احمد وغیرہ۔

پیشہ: درس وتدریس

موجودہ پیشہ: کل وقتی مصنّف وایڈیٹر

پتہ اشرفی ہاؤس، ہارون نگر، سیکٹر-2، پٹنہ-801505

ٹیلی فون 2257983,3090509

موبائل 0612-3114314

ملازمت

- ایک عرصہ تک کلکتہ کے مشہور روزنامہ مثلاً ''عصر جدید''، ''الحق''، ''اخوت'' میں جز وقتی طور پر مترجم وصحافی کے کام کرتے رہے۔ موصوف بعض دوسرے روزناموں سے بھی وابستہ رہے۔
- ۱۹۵۸ء میں لائف انسورنش کارپوریشن کے ڈیولپمنٹ سیکشن میں بحیثیت اسسٹنٹ تقرری ہوئی۔ ان کی پہلی پوسٹنگ پٹنہ میں ہوئی جہاں تقریباً پانچ سال تک ملازمت کی۔ ۱۹۶۴ء میں استعفیٰ دے دیا۔

تدریسی تجربے

- عارضی طور پر کچھ عرصہ ایل ایس کالج مظفر پور میں فارسی اور اردو کے لکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ (ڈاکٹر متین احمد صبا، جو اس کالج میں استاد تھے، ایران چلے گئے، ان کی جگہ خالی ہوئی تو (Vacancy Leave) پر عارضی طور پر موصوف کو ملازمت مل گئی تھی، ڈاکٹر صبا کی واپسی پر آپ ملازمت سے علیحدہ ہو گئے)
- اروند گرلس کالج، پٹنہ میں انگریزی کے جز وقتی لکچرر کی حیثیت سے ایک سال تک کام کیا۔
- اس کے بعد بی ایس اے کالج، داناپور پٹنہ میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔
- ۳رستمبر ۱۹۶۹ء کو موصوف کا تقرر مگدھ یونیورسٹی کے معروف کالج، گیا کالج، گیا میں اردو کے لکچرر کے عہدے پر ہو گیا۔
- کچھ عرصہ بعد ان کا تبادلہ مگدھ یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہو گیا، جہاں انہوں نے انتہائی دلجمعی کے ساتھ جولائی ۱۹۷۶ء تک کام کیا۔
- جولائی ۱۹۷۶ء میں رانچی یونیورسٹی، رانچی کے شعبۂ اردو کے ریڈر کے لئے انٹرویو ہوا۔ موصوف اس میں شریک ہوئے۔ ممتحن میں اور لوگوں کے علاوہ

پروفیسر خورشید الاسلام اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی تھے۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے اور اس طرح موصوف نے ۲۳ر جولائی ۱۹۷۶ء سے رانچی یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف اردو کے صدر اور ریڈر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔ ان کی علمی لگن، دلسوری، انتظامی خوش اسلوبی اور انتھک محنت سے شعبۂ اردو کی کارکردگی میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ رانچی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ان کے عہد سربراہی میں صوبۂ بہار و جھارکھنڈ کا منفرد و ممتاز ادبی و علمی مرکز بن کر ابھرا۔ وہاں نہ صرف تحقیق و تفتیش کی سمت و رفتار میں اضافہ ہوا بلکہ کئی دوسرے پروجیکٹ بھی چلائے گئے۔ سیمینار منعقد کئے گئے۔ شعبہ کی جانب سے مجلّہ کی اشاعت بھی ہوئی جو جدید ادب کی تفہیم میں کلیدی حیثیت کا حامل بنا۔ گویا موصوف کے عہد سربراہی میں رانچی یونیورسٹی، رانچی کے شعبۂ اردو کو جو وقار اور معیار عطا ہوا، وہ پہلے یقیناً ناپید تھا۔

مناصب **چیئرمین:** بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن، پٹنہ

✿ رانچی یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے میں ابھی دو سال کی مدت باقی ہی تھی کہ حکومت بہار نے موصوف کو مارچ ۱۹۹۴ء میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیئرمین کے منصب پر فائز کیا۔ یہاں ان کی کارکردگی میں گورنمنٹ کالجوں کے پرنسپل اور لکچرر کی تقرریوں کے علاوہ بہار کی تمام یونیورسٹیوں کے رجسٹرار اور تمام دوسرے اعلیٰ عہدوں کی تقرری بھی شامل تھی۔ انہوں نے اپنے مدتِ چیئرمین شپ میں ایک سو سے زیادہ پرنسپلوں کو تقرر کیا۔ اس کے علاوہ تقریباً چودہ سو مختلف سبجیکٹ کے لکچرروں کی تقرری بھی کی۔ ان عہدوں کے علاوہ کثیر تعداد میں لکچررس کو ریڈر اور پھر ریڈر سے پروفیسر کے عہدے پر پرموٹ کیا۔ (مارچ ۱۹۹۴ء سے جون ۱۹۹۸ء تک)

چیئرمین بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کونسل، پٹنہ

✿ یونیورسٹی سروس کمیشن کی چیئرمین شپ کی مدت ختم ہونے کے فوری بعد حکومت بہار نے انہیں بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کونسل کے چیئرمین کے عہدے کے لئے منتخب کرلیا۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی فکری و انتظامی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے کاؤنسل سطح کے تعلیمی نظام نیز

امتحانات کے معیار و وقار کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی مشکور کی اور اپنی اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔(جولائی ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۲ء تک)

ادبی حیثیت — بین الاقوامی طور پر جانے مانے اردو رائٹر، منفرد نقاد، محقق، افسانہ نگار، استاد، ایڈیٹر اور دانشور۔ اپنی تنقیدی و تحقیقی نگارشات کے باعث عہد حاضر کے سربرآوردہ ناقدوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اردو میں مابعد جدیدیت کے اہم علمبرداروں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی ادبی دلچسپیاں گوناگوں اور متنوع قسم کی ہیں اور ان کا ادبی کینوس بھی خاصا وسیع ہے۔ اب تک ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اردو سے متعلق موضوعات پر انگریزی میں بھی لکھتے رہتے ہیں۔

زبان دانی — اردو، انگریزی اور فارسی۔

شادی — ۱۹۵۸ء میں۔

اہلیہ کا نام — نسیمہ خاتون بنت سید محمد شعیب (بقید حیات)
موضع بہراواں، پوسٹ شورم پور، ضلع پٹنہ، صوبہ بہار

اولاد — چار بیٹے ہوئے۔

1 بڑے بیٹے سید شکیل اشرفی نے انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا۔ ابھی وہ حکومتِ ابوظہبی کے محکمۂ ٹیلی کام میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ (ان کی شادی مرزا غالب کالج، گیا کے پرنسپل اور سابق وائس چانسلر، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، ڈاکٹر شکیل احمد کی صاحب زادی شاہینہ شکیل سے ہوئی، جو صاحب اولاد ہیں۔)

2 دوسرے بیٹے کا نام سید افروز اشرفی ہے۔ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ (رانچی یونیورسٹی، رانچی سے انگریزی میں ہی پی ایچ ڈی کی سند لی اور اب مگدھ یونیورسٹی کے کالج آف کامرس، پٹنہ میں شعبۂ انگریزی سے وابستہ ہیں۔ (ان کی شادی پروفیسر عبدالواسع، سابق صدر شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور، کی صاحب زادی غزالہ پروین سے ہوئی۔ سید افروز اشرفی بھی صاحب اولاد ہیں۔)

3 تیسرے لڑکے سید انجم اشرفی نے تاریخ میں ایم اے، پی ایچ ڈی اور ایم بی

اے کیا ہے۔ فی الوقت مگدھ یونیورسٹی کے بی ایس اے کالج، داناپور میں تاریخ کے لکچرر ہیں۔ (ان کی شادی جناب بدر عالم، ہیڈ ماسٹر، اسلامیہ ہائی اسکول، شیخ پورہ کی صاحب زادی رہت شیریں سے ہوئی۔ یہ بھی صاحب اولاد ہیں۔)

4 چوتھے بیٹے سید شہیر اشرفی، فزکس میں ایم ایس سی (فرسٹ کلاس فرسٹ) کرنے کے بعد کمپیوٹر انجینئر ہوئے اور فی الحال ہانگ کانگ شنگھائی اینڈ برٹش بینک، ابوظہبی میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہیں۔ (ان کی شادی پروفیسر وہاب اشرفی کے اپنے سالے سیّد محمد سہیل کی صاحبزادی اور راقم الحروف کی سالی شادمانہ سہیل سے ہوئی، جو صاحب اولاد ہیں)

تخلیقی سفر کا آغاز وارتقاء

1 پہلے شعر کی تخلیق ۱۹۵۵ء، اشاعت روزنامہ ''احوت'' کلکتہ
2 پہلی غزل کی تخلیق ۱۹۵۵ء
3 پہلی غزل کی اشاعت ۱۹۵۵ء
4 پہلی نظم کی تخلیق ۱۹۵۵ء، اشاعت ''ہند'' روزنامہ، کلکتہ
5 پہلی نظم کی اشاعت ۱۹۵۵ء
6 پہلی نثری تخلیق (افسانہ) کی اشاعت ۱۹۵۸ء
عنوان ''اپنی اپنی راہ''، مطبوعہ ''بیسویں صدی''، دہلی
7 پہلی تنقیدی تحریر کی اشاعت ۱۹۵۶ء
عنواں۔ تابان القادری کی شاعری مشمولہ ''نقوش تاباں''
8 پہلی تصنیف کی اشاعت ''قطب مشتری ایک تنقیدی جائزہ''، ۱۹۶۷ء

صحافت سے وابستگی

ادبی صحافت/ادارت

- رانچی یونیورسٹی، رانچی کے شعبۂ اردو سے ایک مجلّہ ''نئی قدریں'' نکالا جو عالمی ادب کی سمت و رفتار کی تفہیم کی ایک واضح کوشش تھا۔ یہ مجلّہ آج بھی جدید ادب کی تفہیم میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔
- ۱۹۵۹ء میں پٹنہ سے ایک ماہنامہ ''صنم'' جاری کیا، جو تقریباً پانچ برسوں تک نکلتا رہا، اس رسالہ کی مدّت جتنی مختصر ہے، اتنی ہی اس کی مقبولیت زیادہ۔

اپنے زمانے کے مقبول رسالوں میں ''صنم'' کا بھی شمار ہوتا تھا۔ ادارہ میں وہاب اشرفی کے علاوہ رفیع الدین احمد کا نام بھی چھپتا تھا، ویسے تو اس رسالے کے عام شماروں کا بھی معیار بلند تھا مگر دو شماروں کا ذکر خاص طور سے ضروری ہے۔ اس لئے کہ ''صنم'' کے یہ دو شمارے خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔ میری مراد ''صنم'' کے ''بہار نمبر'' اور ''افسانہ نمبر'' سے ہے۔ اس دو شمارے کی کافی شہرت ہوئی۔

- کلام حیدری کی ادارت میں نکلنے والا مشہور زمانہ ہفتہ وار اخبار ''مورچہ'' میں بہت دنوں تک ''اپنا صفحہ'' کے عنواں سے ادبی کالم لکھتے رہے۔
- ان دنوں ''مباحثہ'' کے مدیر ہیں۔ یہ رسالہ دو ماہی ہے۔ اب تک اس کے سولہ شمارے چھپ چکے ہیں۔ اس رسالے نے اردو دنیا میں اپنی ایک خاص شناخت بنالی ہے۔

ادبی معرکہ

''مورچہ'' میں ہی محمود ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کا وہ مشہور ادبی معرکہ ہوا جو اب باضابطہ کتابی شکل میں ''معرکۂ وہاب اشرفی، محمود ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی'' مرتبہ۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ قلمی جنگ تین ماہ تک جاری رہا تھا۔ اس وقت ''مورچہ'' کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس کی تعداد اشاعت اور صفحات بڑھ گئے تھے نیز قارئین کو اس کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ یہ بحث ایک دو ہفتے سے زیادہ نہ چلے گی۔ تھک ہار کر موصوف دم توڑ دیں گے اور رسوائی کا پٹہ اپنے گلے میں ڈال لیں گے، خود کلام حیدری صاحب کی رائے بھی یہی تھی لیکن جب قلمی جنگ نے طول کھینچا اور دونوں فریقیں کی جانب سے ایک دوسرے کے کمزور پہلوؤں پر زبردست حملے ہونے لگے تو قارئین کرام کو اپنی رائے تبدیل کرلی پڑی، کلام حیدری کی بھی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس طرح یہ جنگ تین ماہ چلنے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس معرکہ میں کون جیتا، کون ہارا اہم نہیں بلکہ اہم تو وہ نکات اور جدیدیت کی بحث کی باریکیاں ہیں جو اس معرکے کے ذریعے منظر عام پر آئیں۔ اس بحث میں یوروپی اور عالمی ادب اور اساطیر کے کتنے ہی

گوشے منور رہوئے ہیں۔

اردو صحافت

1 رکن مجلس مشاورت ماہنامہ ''آہنگ'' گیا (ایک عرصے تک وابستگی رہی)
2 رکن مجلس مشاورت ہفتہ وار ''مورچہ'' گیا (ایک عرصے تک وابستگی رہی)
3 رکن مجلس مشاورت ماہنامہ ''مرغ چمن'' گیا (چند ماہ تک)
4 رکن مجلس مشاورت سہ ماہی ''حصار''، رانچی (چند سالوں تک)
5 رکن مجلس مشاورت سہ ماہی ''عہدنامہ''، رانچی (چند سالوں تک)
6 رکن مجلس مشاورت دو ماہی ''زبان وادب'' پٹنہ (کچھ عرصے تک)
7 رکن مجلس مشاورت سہ ماہی ''فنکار'' گوبند پور، دھنباد

بیرونی ممالک کے تعلیمی اور ادبی دورے

- ۱۹۸۵ء میں لندن میں منعقدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جبلی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی اور ''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا جو بعد میں کانفرنس کی کاروائیوں پر مشتمل انگریزی مجلہ ''Committment'' میں شائع ہوا۔
- ۱۹۹۲ء (جنوری) ماریشش عالمی اردو کانفرنس میں حکومت بہار کے نمائندے کے طور پر شرکت کی اور مقالہ پیش کیا نیز متعدد دانشوروں سے علمی تبادلۂ خیال کیا۔
- مجلس فروغ ادب کی دعوت پر سفر دوحہ، دوبئی اور جشن علی سردار جعفری تقریب میں شرکت۔
- انجمن اردو کی دعوت پر ابوظہبی کا سفر اور متعدد ادبی تقاریب میں شرکت۔
- انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ، لندن کی دعوت پر برطانیہ میں اردو کے مسائل کے متعلق کانفرنس اور مرزا ادیب پر منعقدہ سمینار میں شرکت کی۔ افتتاحی تقریب کی صدارت فرمائی اور دوسرے سیشن میں بھی یہ فرض انجام دیا۔ اس موقع پر جرمن، فرانس اور ایک دو ملکوں کا دورہ بھی کیا۔

علمی و ادبی مشاغل

- یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایک اسکیم کے تحت موصوف جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

میں وریٹنگ فیلورہ چکے ہیں۔

- ساہتیہ اکادمی سے Comparative Indian Literature کی دو ضخیم جلدیں شائع کی ہیں جن میں موصوف کے طویل مضامین شامل ہیں۔
- گنگارام گرگ کی کتاب "International encyclopaedia of Indian literature" کی ساتویں جلد جو اردو کے لئے مختص ہے، اس پر نظر ثانی کے ساتھ متون کی ایڈیٹنگ کی اور اس کا مفصل دیباچہ بھی لکھا۔
- مختلف یونیورسٹیوں مثلا دہلی یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، گورکھپور یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد وغیرہ کی دعوت پر اردو زبان وادب کے مختلف موضوعات پر لکچر دیئے، علمی وادبی مباحثوں میں حصہ لیا اور سیمیناروں میں شرکت کی۔
- ایک منصوبے کے تحت اردو شعراء وادباء اور صحافیوں کی کئی ضخیم جلدوں میں Descriptive Dictionary تیار کر رہے ہیں۔
- مختلف یونیورسٹیوں خصوصا عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں لکچرر، ریڈر اور پروفیسرز کی تقرری میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے شمولیت۔
- ''تاریخ ادبیات عالم'' کا ایک وسیع منصوبہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا۔ اس کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چھٹی جلد طباعت کے مرحلے میں ہے۔

رکن مجلس تعلیمی

- رانچی یونیورسٹی، رانچی کی Senate اور Syndicate کے رکن رہے۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیکلٹی آف ہیومینیٹیز کے رکن رہے۔
- ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم اے کا یکساں نصاب رائج کرنے کے لئے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی، پوسٹ گریجویٹ اردو نصاب، جس کے ایک رکن بھی رہے۔
- رکن اکاڈمک کونسل، رانچی یونیورسٹی، رانچی

دیگر انجمنوں اور اداروں کی رکنیت

- خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کے رکن رہے۔

- رکن مجلس عاملہ، بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ (طویل عرصے تک)
- سینئر نائب صدر، کل ہند انجمن اساتذہ اردو، جامعات ہند (طویل عرصے تک)
- سابق رکن لینگویج ایکسپرٹ اصطلاحات ساری کمیٹی برائے نفسیات، ترقی اردو بورڈ، دہلی۔
- رکن آل انڈیا ریڈیو ایڈوائزری بورڈ، رانچی (طویل عرصے تک)
- سابق رکن، کل ہند اردو رائٹرز اینڈ جرنلسٹ فورم، پٹنہ
- سابق رکن نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
- رکن ریسرچ ڈگری کمیٹی، رانچی یونیورسٹی، رانچی (طویل عرصے تک)
- سابق ممبر پینل ریڈری برائے لٹریری ایوارڈ، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی۔
- سابق رکن مجلس منتظمہ اور مبصر اردو ایڈوائزری بورڈ، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی
- رکن راجیہ بھاشا وبھاگ، اردو ایڈوائزری بورڈ حکومت بہار (طویل عرصے تک)
- سابق رکن مبصر کمیٹی تھوک خریداری کتب اردو، برائے حکومت ہند
- رکن ایوارڈ کمیٹی، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ (طویل عرصے تک)
- رکن ایوارڈ کمیٹی، عالمی فروغ ادب اردو، دوحہ قطر
- سابق رکن نیشنل کونسل بیورو برائے ترقی اردو، گورنمنٹ آف انڈیا
- سابق رکن اکیڈمک کونسل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
- رکن مجلس منتظمہ، کریم سٹی کالج، جمشید پور
- سابق ممبر پینل آف ریڈری، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ برائے اردو
- رکن پبلی کیشن کمیٹی، بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ

دیگر خدمات

- ملک کے طول وعرض میں صدہا ادبی جلسوں و تقاریب میں اردو زبان و ادب کے متعدد موضوعات پر تقریریں کیں اور صدارتی خطبے پڑھے۔
- نیشنل اور انٹرنیشنل سیمیناروں، سمپوزیموں، کانفرنسوں میں خطبے دیے اور وقیع مقالے پڑھے۔
- تقریباً ۴۰ ریسرچ اسکالر کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کرایا۔ ان کی نگرانی میں ہوئے تحقیقی کاموں میں سے بیشتر زیور طبع سے آراستہ ہو چکے

ہیں۔

✿ ریڈیو تبصرے ، فیچر نیز ٹی وی پروگرام میں شمولیت۔

شاگردان

شفق، ڈاکٹر عبدالمنان، ارتضیٰ کریم، قمر جہاں، عین تابش، نار قادری، احمد حسین دانش، جمیل اختر محبی، مصور عمر، مظفر مہدی، شاداب رضی، ابوعبیدہ ادالی، خورشید جہاں، جلیل اشرف، مدرالدین، عبدالقیوم ادالی، اطفر جمیل، پرویز رحمانی، ہمایوں اشرف، رضی الرحمٰن، اسلم جمشید پوری، انور ایرج، سرور ساجد، واحد قریشی، مولا بخش، کہکشاں پروین، انوری بیگم، جمشید قمر، افسر کاظمی وغیرہ۔

مطبوعہ کتابیں (تصنیفات و تالیفات)

1 ۱۹۶۷ء قطب مشتری ایک تنقیدی جائزہ (تحقیق و تنقید)

ناشر کتاب گھر، اسلام پور، مظفر پور، پیش لفظ اختر قادری

دوسرا ایڈیشن وینا پستک بھون (تعلیمی مرکز)، خزانچی روڈ، پٹنہ (۱۹۷۷ء)

(دوسرا ایڈیشن ترمیم و اضافے کے بعد ''قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ'' کے نام سے شائع ہوا)

تیسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، نئی دہلی (۱۹۹۶ء)

(نوٹ اس ایڈیشن میں پروفیسر لطف الرحمٰن کا لکھا ہوا ایک مختصر سا تعارفی نوٹ کتاب کے فلیپ کے دونوں جانب موجود ہے۔)

2 ۱۹۷۰ء سیر اردو (انتخاب) (نصابی کتاب)

ناشر مکتبہ اردو، پٹنہ۔۴ (۱۹۷۰ء)

دوسرا ایڈیشن مکتبہ اردو، پٹنہ۔۴ (۱۹۷۷ء)

3 ۱۹۷۳ء، قدیم ادبی تنقید (تنقید)

ناشر تعلیمی مرکز، خزانچی روڈ، پٹنہ۔۴ (جولائی ۱۹۷۳ء)

''پیش لفظ'' کلیم الدین احمد

4 ۱۹۷۵ء، شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری (تحقیق و تنقید)

ناشر کلچرل اکیڈمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا (۱۹۷۵ء)

دوسرا ایڈیشن ایوانِ ادب، پٹنہ-۴ (۱۹۸۵ء)
تیسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۴ء)

5 ۱۹۷۸ء، معنی کی تلاش (مقالات کا مجموعہ)
ناشر تعلیمی مرکز، خرانچی روڈ، پٹنہ-۴ (۱۹۷۸ء)
دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۵ء)

6 ۱۹۷۹ء کہانی کے روپ (افسانے مع مقدمہ)
پہلا ایڈیشن ناشر تعلیمی مرکز، پٹنہ (۱۹۷۹ء)
دوسرا ایڈیشن کرن اشاعت ہاؤس، گیا (۱۹۹۲ء)

7 ۱۹۸۰ء، نقوش ادب (ترتیب)
ناشر ایوان ادب، پٹنہ-۴ (۱۹۸۰ء)
دوسرا ایڈیشن وینا پستک بھون، خرانچی روڈ، پٹنہ-۴ (۱۹۸۵ء)
تیسرا ایڈیشن کالج پبلشرز، مین روڈ، رانچی (۱۹۹۳ء)

8 ۱۹۸۱ء، مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ (تنقید)
ناشر وینا پستک بھون، پٹنہ-۴ (۱۹۸۱ء)
دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۲۰۰۳ء)
(نوٹ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کا نام تبدیل کر کے 'میر اور مثنویاتِ میر'
کردیا گیا ہے۔)

9 ۱۹۸۲ء، مثنوی اور مثنویات (ترتیب مع متن اور مقدمہ)
ناشر مکتبۂ اردو، پٹنہ-۴ (اگست ۱۹۸۲ء)

10 ۱۹۸۲ء، کاشف الحقائق (ترتیب مع متن و مقدمہ)
ناشر ترقی اردو بیورو، حکومت ہند (۱۹۸۲ء)

11 ۱۹۸۲ء، سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے (تنقید و ترتیب)
ناشر بہار اردو اکادمی، پٹنہ (۱۹۸۲ء)

12 ۱۹۸۵ء، پطرس اور ان کے مضامین (تنقید)
ناشر وینا پستک بھون، خزانچی روڈ، پٹنہ-۴ (۱۹۸۵ء)

13 ۱۹۸۶ء، راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری (تنقید)

کتاب نما کا وہاب اشرفی نمبر

(افسانوی مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی روشنی میں)

ناشر ایوان ادب، پٹنہ-۴(۱۹۸۶ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۴ء)

14 ۱۹۸۶ء، کاشف الحقائق-ایک مطالعہ (تنقید)

ناشر ایوان ادب، پٹنہ-۴(۱۹۸۶ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۴ء)

15 ۱۹۸۶ء، تفہیم البلاغت

ناشر ایوان ادب، پٹنہ-۴(۱۹۸۶ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۲ء

تیسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۲۰۰۲ء)

16 ۱۹۸۹ء بہار میں اردو افسانہ نگاری (افسانے مع مقدمہ)

ناشر بہار اردو اکادمی، پٹنہ-۴(۱۹۸۹ء)

17 ۱۹۸۹ء، آگہی کا منظر نامہ (مقالات کا مجموعہ)

پہلا ایڈیشن ''ایوان ادب'' پٹنہ-۴(۱۹۸۹ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۲ء)

18 ۱۹۹۱ء، تاریخ ادبیات عالم (جلد اوّل)(تنقید اور تاریخ)

پہلا ایڈیشن حضرت بی بی کمال پبلی کیشن، رانچی (۱۹۹۱ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۸ء)

19 ۱۹۹۵ء، تاریخ ادبیات عالم (جلد دوم)(تنقید اور تاریخ)

پہلا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۵ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۸ء)

20 ۱۹۹۵ء، اردو فکشن اور تیسری آنکھ (مقالات کا مجموعہ)

ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۵ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء

21 ۱۹۹۶ء، حرف حرف آشنا (مقالات کا مجموعہ)

کتاب نما کا وہاب اشرفی نمبر

ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۶ء)

2. ۱۹۹۸ء، تاریخ ادبیات عالم (جلد سوم) (تنقید اور تاریخ)

ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۸ء)

2. ۱۹۹۸ء، تاریخ ادبیات عالم (جلد چہارم) (تنقید اور تاریخ)

ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۱۹۹۸ء)

۱۹۹۹ء قاضی عبدالودود

ناشر ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی (۱۹۹۹ء)

۲۰۰۱ء، تاریخ ادبیات عالم (جلد پنجم) (تنقید اور تاریخ)

ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۲۰۰۱ء)

۲۰۰۲ء، مابعد جدیدیت ممکنات و مضمرات

ناشر کتاب محل، ۲۲-اے، سروجنی نائیڈو مارگ، الہ آباد (۲۰۰۲ء)

دوسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی (۲۰۰۴ء)

۲۰۰۳ء، مجروح سلطان پوری

ناشر ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی (۲۰۰۳ء)

متنوعہ تحریریں

1. ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء تک انہوں نے تواتر کے ساتھ تقریباً بیالیس افسانے لکھے۔ ڈاکٹر احمد حسین آزاد نے ۱۹۸۶ء میں ''وہاب اشرفی کے افسانے'' کے نام سے ایک کتاب شائع کرائی جس میں وہاب اشرفی کے اٹھارہ افسانے شریک اشاعت ہیں۔ ڈاکٹر آزاد نے اپنے مقدمہ بعنوان ''ڈاکٹر وہاب اشرفی کے افسانے'' میں وہاب اشرفی کے افسانوں کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔

2. شمس الرحمن فاروقی اور محمود ہاشمی کے ساتھ افسانے کی صنفی اہمیت کے تعین کے سوال پر ہفتہ وار ''مورچہ'' گیا میں وہاب اشرفی صاحب کا جو طویل مباحثہ ہوا تھا، اس کا ذکر قبل بھی ہو چکا ہے، اس ادبی معرکہ کو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ریڈر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی ''معرکۂ وہاب اشرفی، محمود ہاشمی، شمس الرحمن

فاروقی'' کے عنواں سے کتابی شکل میں منظر عام پر لے آئے ہیں۔

3 تقریباً ۱۵۰ کتابوں پر تبصرے اور تجزیے، متعدد کتابوں کے مقدمے، دیباچے اور آراء۔ وہاب اشرفی کے لکھے ہوئے تبصرے اور تقاریظ بڑے معرکۃ الآراء ہوتے ہیں۔ موصوف کے تبصروں اور تقاریظ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں فنکار کے پورے تخلیقی رویّے کو سمیٹ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ راقم الحروف نے ان کے ادبی تبصروں اور تقاریظ کا ایک انتخاب ''نکتہ نکتہ تعارف'' کے نام سے حال ہی میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے ۲۰۰۳ء میں شائع کی ہے۔ اس میں وہاب اشرفی کے تبصروں اور تقاریظ کے حوالے سے راقم کا ایک بھرپور مقدمہ بعنوان ''مقدمہ بر مقدمہ'' بھی شامل ہے۔

4 ابتدائی دنوں میں وہاب اشرفی نے کئی ڈرامے بھی لکھے تھے۔ ان کا ایک ڈراما ''سب خیریت ہے'' خاصا مقبول ہوا ہے۔ یہ ڈراما ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے برابر نشر ہوتا رہا ہے۔

زیر ترتیب واشاعت

1 تاریخ ادبیات عالم (چھٹی جلد) (تنقید و تاریخ)

2 تاریخ ادب اردو (تنقید و تاریخ)

قدر شناسی

- القا پبلشرز کی کتاب "Who's who in India" میں سوانحی خاکہ شامل ہے۔
- ساہتیہ اکادمی کی کتاب "Who's who in Indian literature" میں بھی ان کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر ہے۔
- بہار کے سابق گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی اور شفیع قریشی نے ازراہِ علم نوازی شرف مہمانی بخشا اور ان کی کتاب ''تاریخ ادبیات عالم'' کے لئے پیش لفظ لکھا۔
- ڈاکٹر مناظر حسن، سابق وزیر فن و ثقافت اور اسپورٹس حکومت بہار نے ڈاکٹر عبدالواسع، سابق صدر شعبہ اردو، بہار یونیورسٹی، مظفرپور کی نگرانی میں ''ڈاکٹر وہاب اشرفی حیات اور کارنامے'' کے عنواں سے تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ

ڈی لکھا تھا۔ انہیں ۱۹۷۸ء میں ہی بہار یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند مل چکی ہے۔ ۲۰۰۱ء میں ان کا یہ تحقیقی مقالہ ترمیم و اضافے کے ساتھ ''وہاب اشرفی۔شخصیت اور فن'' کے نام سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

- جناب نسیم اختر کو ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ سے ان کے تحقیقی مقالہ ''اردو تنقید میں وہاب اشرفی کا مقام و مرتبہ'' پر پی۔ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ پروفیسر خورشید جہاں کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔
- محترمہ شہناز خاتون نے بھی ڈاکٹر شیخ محمد قیوم (عبدالقیوم ابدالی) کی نگرانی میں ایک تحقیقی مقالہ ''مابعد جدید اردو تنقید کو وہاب اشرفی کی دین'' قلم بند کیا ہے۔ ان کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی ڈگری، رانچی یونیورسٹی میں جمع ہو چکا ہے۔
- پروفیسر نعیم کوثر، بہار یونیورسٹی، مظفر پور کی نگرانی میں محمد امجد صاحب نے ''وہاب اشرفی کی افسانہ نگاری'' کے حوالے سے تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کا تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی ڈگری یونیورسٹی میں پیش کیا جا چکا ہے۔
- اس کے علاوہ متعدد ریسرچ اسکالرز کئی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے مقالات تحریر کر رہے ہیں۔
- کئی کتابیں (ہر اس یونیورسٹی میں جہاں اعلیٰ سطح پر اردو پڑھائی جاتی ہے) یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔
- سرور کریم ''وہاب اشرفی کا ادبی سفر'' نام سے ایک کتاب تحریر کر چکے ہیں۔ یہ کتاب عیسیٰ پبلی کیشنز، نئی دہلی کے زیر اہتمام ۱۹۹۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔
- ہند و پاک کے متعدد ادیبوں اور ناقدوں نے تعلیمی کام اور ادبی خدمات کو سراہا۔
- ادیبوں، شاعروں، اسکالروں وغیرہ نے کثرت سے اپنی کتابیں موصوف کے نام معنون کی ہیں۔
- راقم الحروف کی مرتبہ کتاب ''وہاب اشرفی عکس اور جہتیں'' (متعدد ادیبوں

کے مضامین کا مجموعہ) زیر طبع ہے۔

ایوارڈز

- بھارتیہ بھاشا پریشد، کلکتہ کی جانب سے ۱۹۹۴ء میں "تاریخ ادبیات عالم" پر ایوارڈ ملا۔ انہیں یہ انعام ۱۱رفروری ۱۹۹۶ء کو دلی میں صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں ملا۔
- ۱۹۸۵ء میں مجموعی ادبی خدمات پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے "سجاد ظہیر" ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔
- ۱۹۹۶ء میں حکومت بہار محکمہ راج بھاشا (اردو ڈائرکٹوریٹ) کا پروقار حضرت مکی میری ایوارڈ برائے عمر بھر کی خدمات اردو ادب تنقید و تحقیق کے میداں میں (ایک لاکھ روپے اور توصیفی سند) بھی انہیں مل چکا ہے۔
- میر تقی میر ایوارڈ (میر اکیڈمی، لکھنؤ) برائے خدمات ترقی اردو۔
- "بہار اردو اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز کلیم الدین احمد ایوارڈ برائے تنقید۔
- سائنس اور کائنات سوسائٹی آف انڈیا نے علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں انہیں "Son of soil" ایوارڈ سے سرفراز کیا۔
- ۲۰۰۱ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی جانب سے غالب انعام (برائے اردو نثر) پروفیسر نذیر احمد (وائس چیئرمین، غالب انسٹی ٹیوٹ) کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔
- ۱۹۹۸ء میں (۱۷رستمبر ۱۹۹۸ء کو) مجلس فروغ ادب، دوحہ، دوبئی نے حشن علی سردار جعفری کے موقع پر لوح سپاس سے سرفراز کیا۔

کتابوں پر انعامات/اعزازات

- "شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری" پر بہار اردو اکادمی کا پہلا انعام۔
- "شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری" پر اتر پردیش اردو اکادمی سے بھی انعام ملا۔
- "قدیم ادبی تنقید" پر بہار اردو اکادمی کا انعام۔
- "معنی کی تلاش" پر ۱۹۷۹ء میں اتر پردیش اور بہار اردو اکادمی کے انعامات۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے اس کتاب پر پہلا انعام دیا تھا۔

- ترقی اردو بیورو سے شائع شدہ کتاب ''کاشف الحقائق'' (ترتیب مع مقدمہ) پر ۱۹۸۳ء میں بہار اردو اکادمی نے انعام دیا۔
- ''مثنوی اور مثنویات'' پر ۱۹۸۲ء میں بہار اردو اکادمی کا انعام۔
- ''آگہی کا منظرنامہ'' پر ۱۹۹۰ء میں بہار اردو اکادمی کا کلیم الدین احمد اعزازی انعام۔
- ''تاریخ ادبیات عالم'' پر ۱۹۹۴ء میں بھارتیہ بھاشا پریشد کا انعام۔

مختلف اوقات میں متعدد اہم اداروں کی معاونت

- ممبر انٹرویو بورڈ، بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن برائے لیکچرر (بعد میں اسی ادارے کے چیئرمین ہوگئے)
- ممبر انٹرویو بورڈ، بہار پبلک سروس کمیشن برائے ریڈر/ پروفیسر اور دوسرے امتحانات۔
- ہندوستان کے موقر اور معروف یونیورسٹیز مثلاً جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، گورکھپور یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی وغیرہ کے پی۔ایچ ڈی اور ڈی لٹ ڈگری کے لئے لکھے گئے تحقیقی مقالے کے ممتحن رہے۔
- ممبر انٹرویو بورڈ برائے تقرری اردو ریڈر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
- ممبر انٹرویو بورڈ برائے تقرری پرنسپل، کریم سٹی کالج، جمشید پور۔

انتظار حسین

وہاب اشرفی اور تصور دانشوری

ایسے افراد جنہیں ہم اردو ادب کے تعلق سے دانشور کہتے ہیں وہ بہت کمیاب ہیں۔ اس امر کا اظہار ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنی کتاب ''آگہی کا منظر نامہ'' میں کیا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی ہندوستان کے چند نامور نقادوں میں ہیں جنہوں نے ادبی موضوعات پر کافی لکھا ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر ان کے مضامین کے تین مجموعے ہیں جن میں انہوں نے مختلف موضوعات اور مصنفین (نئے اور پرانے) کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک عنوان جس پر میری خصوصی توجہ گئی وہ اردو کے دانشوروں سے متعلق ہے۔ دانشور کون ہے؟ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں۔ بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں اس لفظ کا استعمال بڑی بے رحمی سے کیا گیا ہے۔ ہم لوگ بہت سخی ہو کر کسی کو بھی دانشور کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً کتابوں کے رسیا یا ادب کے معاملات سے متعلق اشخاص کو۔ خصوصاً ایسے معاملات جو دانشوری کے متقاضی ہیں۔

ماضی میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ دستخطوں سے جو اخباری بیانات آتے ہیں ان میں ادیب اور دانشور لکھا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو ادیب نہیں ہیں اور محض بعادت کے موضوعات پر لکھتے ہیں یا قومی مسائل پر، انہیں آسانی سے دانشور کہہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشرفی دانشوری کا تمغہ اس طرح بانٹنے کے روادار نہیں ہیں، وہ اسے غیر معمولی اسکالرشپ سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک دانشور سے مفکر ہونے کا تقاضہ کرتے ہیں جو اپنے موضوعات پر کافی غور و خوض کرتا ہو اور دانشورانہ تدبّر سے کام لیتا ہو پھر اس کے بارے میں اظہار رائے کرتا ہو۔

ڈاکٹر اشرفی کہتے ہیں کہ دانشور وہ ہے جو ادب کے علاوہ بھی دوسرے موضوعات پر قلم اٹھاتا ہو جیسے معاشیات، عمرانیات، فلسفہ وغیرہ۔ لیکن ایسے لکھنے والے اردو میں بہت زیادہ نظر نہیں آتے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ایسے لکھنے والوں کی اردو میں بہت کمی ہے۔ اس سلسلے میں

ڈاکٹر اشرفی نے ہماری توجہ معاشیات کے مفکرین کی کمی کی طرف مبذول کرائی ہے۔ وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ معاشیات سے دلچسپی ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ مذہبی اور روحانی اصطلاحات اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ معاشی فکر متاثر ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر اشرفی ایک دوسری آئرنی کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ ہر چند کہ اردو میں ترقی پسند تحریک نے کافی زور پکڑا لیکن مارکس، انجلس اور لینن کے معاشی تصوّرات سے ہم گہرے طور پر واقف نہ ہو سکے۔ پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم اور سجاد ظہیر نے اس باب میں جو کام کیا وہ عمومی نوعیت کا ہے۔

دراصل ہمیں ایک ایسے معاشی مفکر کی ضرورت تھی جو مارکس کے معاشی تصوّر پر تفصیلی گفتگو کر سکے اور یہ کام اردو دانشور نہیں کر سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر اشرفی یہ کہتے ہیں کہ ''داس کیپیٹل'' کا اردو میں تجزیہ ہونا ہنوز باقی ہے۔ اس طرح جدید نفسیات کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرفی کہتے ہیں کہ فرائڈ، یونگ اور ایڈلر کے تصوّرات کے بارے میں ہم ادبی تحریروں سے ہی واقف ہوئے۔ ہمارے یہاں ایسے دانشور اور ماہرین نہیں جو ان موضوعات پر عالمانہ ڈھنگ سے گفتگو کر سکیں اس لئے ایسی کوئی کتاب جو فرائڈ یا یونگ کے تصوّرات کو بطریق احسن پیش کر سکے، اردو میں کمیاب ہے۔ جدید فلسفیانہ اصطلاحات جیسے وجودیت سے بھی ہم ادبی مصنفین کے ذریعہ ہی متعارف ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے دانشور نہیں جو ایسے افکار پر باضابطہ تجزیاتی مرحلے سے گزریں جبکہ وجودیت کی بحث دانشوری کی دنیا میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے پروفیسر اشرفی کا تجزیہ ہے کہ اردو مصنّفین کو دو طرح کے رول انجام دینے ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ بنیادی طور پر ادیب بنے رہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہ وہ دوسرے علمی خزانے کی کھوج خبر بھی لیتے رہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح ان کا رشتہ دانشوری سے بالواسطہ قائم ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں حقیقی دانشوری کی بے حد کمی ہے یہ اور بات ہے کہ اردو کے ادیبوں نے اپنا دوسرا رول اپنے حدود میں بطریق احسن انجام دیا ہے۔ اس لئے بھی کہ ہم اس سے آگاہ ہیں کہ جدید نفسیاتی امور پر دانشورانہ طور پر اردو میں فکری مباحث سامنے لانے والے بہت کم ہیں۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادیبوں نے کسی حد تک فرائڈ اور یونگ کے تصوّرات ادبی لبادے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر اشرفی کے مطابق اردو میں چند ایسے لوگ ہیں جنہیں دانشور کہا جا سکتا ہے۔ انہیں

میں ایک عابد حسین ہیں ان کے علاوہ پروفیسر اشرفی نے ،انشوروں کی ایک مختصر فہرست پیش کی ہے۔ بہرطور انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ اردو میں دانشوری ادبی روایات کے طور پر ہی پھلتی پھولتی رہی ہے۔

ڈاکٹر اشرفی دراصل آزادی کے بعد کے حالات سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں دانشوری کی روایت زیادہ پھل پھول نہ سکی اس کے اسباب ہوں گے اور ڈاکٹر اشرفی کو کم ازکم علی گڑھ یونیورسٹی کے اسکالروں سے بحث کرنی چاہئے۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں بھی یہ صورت مختلف نہیں ہے حالانکہ پاکستانی بہتر پوزیشن میں تھے کہ دانشوری کی روایت کی توسیع کر سکیں۔

ہماری پاکستانی یونیورسٹیوں میں دانشوری کی روایت کو پھلنے پھولنے کے زیادہ مواقع حاصل نہ ہو سکے۔ کسی حکومت نے بھی اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ بہرطور ادبی روایت اپنے طور پر پروان چڑھتی رہی ہے۔ اس وجہ سے جو منفی صورت واقعہ سامنے آسکتی ہے اس کا احساس اب ہم لوگ کرنے لگے ہیں۔

(انگریزی سے ترجمہ، ''DAWN''، کراچی مورخہ ۵؍نومبر ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر قمر رئیس

وہاب اشرفی کی تلاش میں

ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کو ہم اپنے سے بہت قریب جانتے اور مانتے ہیں، جب سوچتے ہیں تو بہت فاصلے نکلتے ہیں۔ جیسے وہ شخص بے تکلف دوستی کے باوجود ہماری پہنچ سے دور تھا۔ ہمارے اس کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ تھا پھر بھی ہم اس کی شناخت سے محروم رہے۔ اس کے عملی کردار اور ذہنی مشغلوں سے ہماری آگہی ایسی نہیں کہ اسے معتبر کہا جا سکے۔ مزہ کی بات یہ کہ دوستوں میں دوری کے اس عجیب احساس میں خطاوار کوئی نہیں ہوتا اور اس حقیقت کا ادراک اکثر اس وقت ہوتا ہے جب اس شخص کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی ترغیب ہوتی ہے۔

وہاب اشرفی سے میری دوستی کا رشتہ لگ بھگ پینتیس سال پرانا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس دوستی میں ہمارے ادبی اختلافات نہ کبھی آڑے آئے نہ کسی سنجیدہ بحث یا نزاع کا موجب بنے۔ اس دوران ہم لوگ پٹنہ، رانچی، گیا، لکھنؤ، لندن اور دوسرے شہروں کی ادبی مجالس میں درجنوں مرتبہ ملے، ساتھ رہے، ادبی مذاکروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نجی یا احباب کی گھریلو محفلوں میں دل کھول کر دادِ نشاط بھی دی۔ بعض احباب نے ہماری دوستی کو رقیبانہ نظروں سے دیکھا تو ہم نے اس کی پروا بالکل نہیں کی۔

وہاب کی ذات میں غیر معمولی ذہانت اور فہم و فراست کے علاوہ جو بات مجھے پسند رہی وہ ہے اس کی سادگی، حق گوئی اور مصنوعی اطوار سے دوری۔ اکثر اس کے رویے میں کم سنی کی معصومیت بھی جھلک دکھاتی ہے۔

تو یہ صورت حال تھی جب پچھلے دنوں اچانک ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے وہاب صاحب کے بارے میں ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ سوچ میں پڑ گیا۔ کون وہاب؟ وہی جو تین دہوں سے زیادہ عرصہ سے میرے خاص مقرب اور پیارے دوست ہیں یا کوئی اور؟ شاید ڈاکٹر اشرف اس وہاب کے بارے میں مضمون چاہتے ہیں جو اردو ادب و دانش کی جانی مانی شخصیت ہیں۔ میں

ے خاموشی سے وعدہ تو کرلیا لیکن یہ احساس یقیناً میرے لئے چونکا دینے والا تھا کہ جس وہاب کی دوستی کو میں نے مالِ مفت سمجھ لیا تھا اب اس کے ادبی اور علمی حوالوں کو سوچنا اور سمیٹنا ہوگا۔ اب اس کبرسنی میں اتنی سکت تو رہی نہیں کہ وہاب کی ساری کتابوں کو از سر نو پڑھوں اور ان کی جملہ فتوحات کے بارے میں ایک سنجیدہ مقالہ سپردِ قلم کروں۔ اس لیے کسی معقول اور مرتب خاکے کے بغیر اضطراری طور پر جو کچھ ذہن میں آرہا ہے وہ لکھ رہا ہوں۔

وہاب کی شخصیت کا ایک خاص پہلو جس نے مجھے متاثر کیا، یہ ہے کہ وہ ہر طرح کے رواجی توہمات اور ظلمت پسندانہ تولیدہ خیالی سے اپنی ذات کو پاک رکھتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں وہ ایک تعقل پسند جدید انسان ہیں۔ ایسی مصفا اور بالیدہ سیرت مجھے ادیبوں میں کم دکھائی دی۔ دوسری جانب ان کی ذات میں ایک ایسے شوق و رومان کی روشنی چھپی نظر آتی ہے جو معاصرین سے ان کی پہچان کچھ الگ بناتی ہے۔ مجھے لگا کہ اسی لئے وہ دوستوں کے دوست، ایک محبوب استاد اور اہل علم کی محفلوں میں چھا جانے والے انسان ہیں۔ وہ جو سماج کی نچلی سیڑھی سے اوپر تک چڑھے ہیں اس میں ان کی فطری ذہانت، محنت، تھوڑی سی دنیادارانہ مصلحت بینی کے علاوہ ان منفرد اوصاف کا حصّہ بھی رہا ہے۔

تقریر ہو یا تحریر، وہاب مغرب کے ادبی فلسفوں کے باریک اور نازک نکتوں کو جس سرعت اور آسانی سے گرفت میں لے لیتے ہیں اور پھر جس وضاحت اور سلجھے ہوئے انداز سے اردو میں اس کی ترجمانی کرتے ہیں اس میں پروفیسر نارنگ کے علاوہ شاید ان کا کوئی شریک و مقابل نہیں۔

ادبی نظریوں کے کاروبار میں ان کے سروکار معاصرین سے زیادہ معروضی اور غیر جذباتی نظر آتے ہیں، یعنی وہ کسی ادبی نظریہ کو اس کے مطالعہ اور تعبیر کے باوجود شخصی اعتقاد Conviction کا حصّہ نہیں بناتے۔ اس سلسلہ میں وہاب کا رویّہ کچھ ایسا ہے۔

''سب کو جانو، کچھ کو پہچانو، کسی کو نہ مانو''

یہی وجہ ہے کہ ایک رجحان یا نظریہ سے دوسرے رجحان یا تصوّر کی سمت قدم بڑھانے میں انہیں کبھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ اس میں وہ کسی عبوری وقفہ کے قائل بھی نہیں، بس تھوڑا سا دم لے کر کسی بنجارے کی طرح پچھلا ٹھاٹھ چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں اور ان کے معاصر یا ہم چشم دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اگرچہ وہاب کے اس تصوّر کی معنویت مجھ پر کبھی کھل نہ سکی کہ مشرق کے پسماندہ ادب کو

بلندیوں کی سمت لے جانے کے لئے مغربی ادب کے استفاد کی جانب رجوع ہونے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ ماننے میں تامل نہیں کہ مغرب کے ادبی سانچوں اور معتبر کسوٹیوں کو موثر ڈھنگ سے متعارف کرانے میں انکا جو رول رہا ہے وہ اس میدان میں کلیم الدین احمد کے رول سے زیادہ وقیع اور وسیع ہے۔ وہ نوجوان نسل کے ادیبوں کو اس لئے بھی متوجہ کر سکا کہ وہ نئی تنقید اور تجزیۂ متن کی بے روح حد بندیوں سے آگے اور آس پاس بھی دیکھتے رہے ہیں۔ اسی لئے میری دانست میں ایک زمانہ میں ان کا شمار 'رواں گارڈ' کے بیرق برداروں میں ہونے لگا تھا۔ لیکن اگر وہ اسی شہرت اور ناموری کے اسی قلیل سرمایہ پر قناعت کر لیتے اور اعلیٰ ادب کے سنجیدہ مطالعہ سے اغماض برتتے تو مجھے شک ہے کہ آج ادب میں ان کی کوئی معتبر شناخت یا آواز ہوتی۔ اس سچائی کو وہاب نے اپنے بعض خوش قامت معاصرین سے ذرا پہلے سمجھ لیا تھا۔ اس لئے کلاسیکی اور نو کلاسیکی ادب کے مطالعہ کی طرف بھی وہ سنجیدگی سے توجہ دیتے رہے۔

وہاب اشرفی سے میرا ابتدائی تعارف ''آہنگ'' گیا میں شائع ان کے کچھ معرکہ خیز مضامین سے ہوا۔ لیکن ان کی پہلی اہم تصنیف جس نے متوجہ کیا ''قدیم ادبی تنقید'' تھی۔ اس عہد میں یہ خاکسار طلباء کو تنقید اور اس کی تاریخ کا پرچہ پڑھاتا تھا اور مغربی تنقیدی نظریات کے لئے بعض انگریزی کتب سے استفادہ کرتا تھا۔ لیکن مذکورہ کتاب میں مغربی تنقید کے بنیادگزاروں میں وہاب صاحب نے افلاطون، ارسطو اور لانجائنس کے نظریات کو جس سادگی، وضاحت اور روشن استدلال کے ساتھ پیش کیا تھا اور ایک معروضی انداز اختیار کرتے ہوئے جس طرح ان کی فکر کی جگہ جگہ گرفت بھی کی تھی اس نے متاثر کیا۔ ہر چند کہ وہاب صاحب نے انگریزی کتب سے ہی یہ سارا مواد اخذ کیا تھا لیکن اس کو جس سلیقہ، تسلسل اور افہام و تفہیم کی آزاد فضا میں پیش کیا تھا اس سے ظاہر تھا کہ یہ صرف ترجمہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے مغربی ادبیات سے وہاب صاحب کی گہری دلچسپی اور خوش ذوقی کے نقوش بھی اجاگر ہوتے نظر آتے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ طلباء بھی اس سلجھی ہوئی کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد جب ''ادبیات عالم'' کی جلدیں آنا شروع ہوئیں تو حوالے کی اس قاموسی کتاب کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر مجھے ''قدیم ادبی تنقید'' اور ''ادبیات عالم'' کے مابین ایک معنی خیز اندرونی ارتباط کا احساس ہوا۔ دونوں میں ڈاکٹر اشرفی کی یہ خواہش مشترک تھی کہ اردو زبان کے دریچے ہر سمت کھلیں۔ اس طرح نو آبادیاتی یا برطانوی ذہن کے مدت سے بندھے ہوئے تسمے کچھ ڈھیلے ہوں گے۔ ہر سمت اور ہر براعظم کی تازہ ہوائیں اردو زبان کو بوسیدگی سے محفوظ رکھ سکیں گی۔

''ادبیات عالم'' کی جلدوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ عہد عتیق سے لے کر عہد جدید تک کے ایشیائی اور مغربی دیاروں کے ادب کا تعارف یکساں محنت اور دلجمعی سے کرایا گیا ہے۔ جو عالمی ادب کو وقیع انسانی میراث اور نمویذیر انسانی اقدار وافکار کا سفرنامہ سمجھ کر پڑھے اور بہرہ مند ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو زبان کو ڈاکٹر اشرفی کی قیمتی سوغات ہے اور اس سے اس زبان کے شرف اور امارت میں اضافہ ہوا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے بعض دوسری ہندوستانی زبانوں میں عالمی ادبیات کی کچھ قاموسیں تو موجود ہیں لیکن اس کردار اور ایسی وسعت نظر کے ساتھ لکھی ہوئی عالمی ادب کی کوئی تاریخ دستیاب نہیں۔ اس تصنیف کی بعض کمیوں اور کوتاہیوں کی طرف کچھ اہل نظر نے اشارہ کیا ہے۔ اس فہرست میں مزید اضافہ ممکن ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ مستقبل قریب میں عالمی تہذیب اور ادب کے رنگارنگ خزانوں کو متھ کر اردو کا کوئی ادیب، تن تنہا اپنے بوتے پر ایسی شگفتہ اور دلچسپ کتاب مرتب کر کے پیش کر سکے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی ''شعر العجم'' جیسی چند کتابوں کو چھوڑ کر اردو میں اس نوع کی جو کتابیں دیکھنے میں آئی ہیں وہ خشک معلومات کی کھتونی سی بن جاتی ہیں۔ ان کا اسلوب مذہبی کتب کی طرح بے روح اور بے رنگ ہو جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر اشرفی نے مختلف زمانوں اور مختلف زمینوں سے تعلق رکھنے والے ذخیرۂ ادب کی خصوصیات کے بیان میں اور ترجموں میں جو تخلیقی رویہ برتا ہے اس میں خود ان کی شخصیت کا رومانی جوہر اور جمالیاتی وجدان جھلک اٹھتا ہے۔

''تاریخ ادبیات عالم'' کی دوسری جلد کے آغاز میں ہی ڈاکٹر اشرفی نے ڈیڑھ ہزار قبل مسیح میں لکھی ہوئی ایک نظم کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں۔

''اس نظم میں حیرت انگیز طور پر محبوب اور شوہر کو شراب پینے اور عورتوں کی لطف آمیز صحبت کے بارے میں رغبت دلائی گئی ہے۔ خواہشوں کی تکمیل کا درس دیا گیا ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ عالم آخرت، نیند کی سرزمین ہے۔ جس پر تاریکی مسلط رہتی ہے۔ یہ غم اور دکھ کی جگہ ہے۔ لہٰذا خوش رہیے، عشق کرنے، مزے اڑانے اور زندگی کو نشاطیہ انداز میں گزارنے کا سبق دیا گیا ہے۔ موت کی دہشت کا بھی ذکر ہے''۔ اس نظم کا تاثر اتنا گہرا ہے کہ مصنف نے اس کا ایک نہیں، دو مختلف ترجمے دیئے ہیں، ایک دیکھیے

خوش آمدید محبوب/شوہر/دوست

شراب پینے

عورتوں کی محبت سے حظ اٹھانے
اور اپنے دن ہنسی خوشی گزارنے سے گریز مت کر،
دن رات اپنی خواہش پوری کر
اپنے دل کو رنجیدہ مت ہونے دے
کیونکہ دھرتی پر برسوں کی تعداد اتنی ہی ہے کہ
ہم یہی سب کرنے میں بسر کر دیں

موت ہر ایک کو اپنے پاس بلاتی ہے
وہ کانپتے دل کے ساتھ اس کے پاس آتے ہیں
اور اس کے خوف سے لرزاں ہیں۔

جلد دوم ص ۳۵

''عیش کوشی'' کے اس حیاتی فلسفہ کے نشانات قدیم مصر ہی نہیں قدیم ہندوستان میں بھی ملتے ہیں نظم کا خاص پہلو یہ ہے کہ ایک عورت نشاط انگیزی کی دعوت دیتی ہے۔ بلاتی ہے۔

ہندی کے ایک ممتاز ادیب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہر زبان کی بنیاد اس کے لوک ادب کی روایت پر استوار ہوتی ہے اور چونکہ اردو کا کوئی لوک ادب نہیں ہے اس لئے اسے ایک آزاد اور علیحدہ زبان کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کھوکھلے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لئے میں نے دہلی یونیورسٹی میں بڑے پیمانے پر ایک سیمینار کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شکیلہ اختر صاحبہ نے بہار کے اردو سماج کے لوک گیتوں پر کام کیا ہے۔ انہیں میں نے دعوت دی اور ان کے ساتھ وہاب اشرفی صاحب کو اس اہم سیمینار میں مدعو کیا۔ میرا خیال تھا کہ عوامی ادب اور عوامی کلچر سے وہاب صاحب کا کوئی خاص رابطہ نہیں رہا ہے۔ لیکن جو مقالہ انہوں نے سیمینار میں پڑھا اور جو گفتگو کی اس نے سب کو چونکا دیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ادب کے حوالے سے ان کی دلچسپیوں اور مطالعہ کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ کتنا متنوع ہے۔ پھر یہ کہ لوک ادب کے تئیں ان کا رویہ نہایت ستھرا اور ترقی پسندانہ تھا۔ ایسا تحقیر آمیز نہیں جیسا کہ ہمارے بزرگ عالموں نے روا رکھا۔ لوک ادب اور گیتوں کی وہاب صاحب نے ایسی خوبصورت اور تاثر آفریں مثالیں دیں جن سے اس ادب کی تہذیبی اور سماجی جڑوں کے ساتھ ساتھ اس کی فنی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ مثلاً سسرال جا کر ایک معصوم ہندوستانی لڑکی پر اکثر جو وحشیانہ ظلم روا رکھا جاتا ہے اس کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے وہاب

صاحب نے لکھا ہے کہ ایسے سو سے زیادہ لوک گیت ان کے پاس محفوظ ہیں۔ یہ لوک گیت دیکھیے

کوئی جاکے دے دے سندیس
بابا گھر کوئی جاکے دے دے سدیس
ساسو، نند یا طعنہ مو ہے مارے، کا ہے دیونا دیج
کوئی جاکے دے دے سندیس
سیج سجاوٹ ڈر مو ہے لاگے
کیسے کروں ریج
کوئی جاکے دے دے سندیس
دیورا مورا مارے، سسر گریاوے
کیسے رہوں پی کے دیس
کوئی جاکے دے دے سندیس
ہمکا ملا لوباوا، جیا گھبرائے
جاں مارے ہمرا دیج
کوئی جاکے دے دے سدیس
بھوک تڑپاوے، نیند نہیں آوے
کوئی جاکے دے دے سندیس

سسرال والوں کی بے دردی اور سفاکی کے نتیجہ میں ایک معصوم لڑکی کس طرح کے ذہنی کرب اور عذاب سے گزرتی ہے۔ یہ گیت اس کی بولتی مثال ہے۔ اس سیمینار میں وہاب صاحب کی جوشیلی شرکت سے مجھے ان کے تہذیبی اور بشری وژن (Vision) کی وسعت کا اندازہ بھی ہوا۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مابعد جدید عہد میں ہی ادب کے تہذیبی عوامل اور لوک کلچر کی اہمیت پر زور دیا جارہا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں، خصوصاً سابقہ اشتراکی ملکوں میں لوک کلاؤں اور لوک ادب کی اہمیت اور مطالعہ پر بیسویں صدی میں بے حد توجہ دی گئی ہے۔ اس میں جو رنگا رنگی ہوتی ہے، بے ساختگی اور سادگی ہوتی ہے، علاقائی لوک کہانیوں اور گیتوں میں عوامی تجربات کی شدت اور سچائی کا جو آہنگ رقص کرتا ہے وہ کلاسیکی اور شہری ادب کی روایت سے خاصہ مختلف ہوتا ہے۔ وہاب اشرفی کو یقیناً اس سچائی کا احساس رہا ہے، جس کا بھرپور اظہار ''تاریخ ادبیات عالم'' کی

مختلف جلدوں میں اوراں کی حالیہ تصنیف ''مابعد جدیدیت ممکنات ومضمرات'' میں بھی ملتا ہے۔ یہ اں کی ادبی بصیرت کا ایسا تابناک اور منفرد پہلو ہے جس کی داد کم ازکم میں نے دل کھول کر دی ہے۔

وہاب اشرفی جدید تر ادبی نظریات کی پیروی کے باوجود اپنے تنقیدی موقف اور مطالعہ میں، امید کے خلاف، ایک ایسا اسلوب اور استدلال اختیار کرتے ہیں کہ اں کی تنقید پختہ ذہن ادباء، دانش گاہوں کے طلباء اور عام قارئین سب کو یکساں طور پر اپیل کرتی ہے۔ اس کا خاص سبب شاید یہ ہے کہ ایک اچھے استاد کی طرح وہ اپنے نوعمر طلباء سے بہت مانوس اور قریب رہے ہیں۔ اں کے ذہن، ذوق اور دوسرے مسائل کو سمجھنے کی انہوں نے ہمیشہ کوشش کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مضامین اور کتابوں میں بڑے اور پیچ دار مسائل کو چھیڑنے سے پہلے نئی ادبی اصطلاحوں اور Concepts کو نہایت شفاف ڈھنگ سے واضح کرتے ہیں۔ ضرورت ہوتی ہے تو اجمالاً اس کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طریق کار کی وجہ سے دقیق فلسفیانہ نکات بھی قاری کے ذہن میں صاف ہوتے جاتے ہیں۔ اپی تازہ تر تصنیف میں جس کا موضوع ''مابعد جدیدیت'' کے رموز اور اں کے مآخذ ہیں (اور اں کا اطلاق بھی) وہاب اشرفی نے افہام وتفہیم کا بالکل یہی طریقہ اختیار کیا ہے جس کی داد ایک خط لکھ کر میں نے انہیں دی تھی۔ لیکن یہاں میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے جن مضامین اور کتب میں انہوں نے کلاسیکی ادب کی نئی دریافت کی کوشش کی ہے وہاں بھی اں کے محرکات اور طریق کار یہی ہیں۔ یعنی ایک اسکالر کے ساتھ ساتھ وہ ایک معلّم کی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں غالب، مومن اور اقبال کی شاعری پر لکھے ہوئے ان کے مضامین پڑھے جاسکتے ہیں۔ مجھے اں کی ادبی شخصیت کا یہ پہلو اس وقت ہاتھ آیا جب اتفاقاً میر تقی میر کی مثنویات پر میں نے اں کی کتاب پڑھی۔ یہ کوئی بیس سال قبل کا واقعہ ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں ایک لازمی پرچہ میر تقی میر کے خصوصی مطالعہ کا رہا ہے۔ تقریباً بیس سال تک یہ خاکسار اور خواجہ احمد فاروقی صاحب مل کر یہ پرچہ پڑھاتے رہے۔ فاروقی صاحب سال میں صرف ایک لکچر دیتے تھے۔ کلاس میں آکر وہ بورڈ پر ایک بڑا دائرہ بناتے اور بتاتے کہ یہ اٹھارہویں صدی کا ہندوستان ہے۔ پھر اس عہد کی تہذیب، معاشرت، علوم وافکار، عوام وخواص کے مشغلے اور رسم ورواج کی کچھ تفصیل بتاتے جو سب اس طلسمی دائرے کے اندر آتی۔ آخر میں اس دائرے کے مرکز میں ایک نقطہ رکھتے اور کہتے، ''لیجیے یہ میر تقی میر ہیں''۔ تدریس کا باقی کام میں کرتا رہتا۔ ایک دن اچانک ایک طالب علم کے

ہاتھ میں میر تقی میر کی مثنویوں پر وہاب صاحب کی ایک کتاب دکھائی دی۔ میں نے اسے لے کر پڑھا اور پھر حاصل بھی کر لیا۔ پہلے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میر پر لکھی ماقبل کی کتابوں کے مقابلہ میں یہاں میر کے مطالعہ کا معیار زیادہ بالیدہ اور بلند تھا۔ یہ پہلا تاثر تھا۔ لیکن اس کے بعد جب کتاب کے مطالب اور مصنف کے تنقیدی طریق کار پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہاب صاحب موضوع کی ضرورت کی ترغیب پر کتنی آسانی سے اپنے پسندیدہ موقف یعنی ''تجزیہ متن'' کی تنگ دامانی سے باہر نکل آئے اور میر کی مثنویوں کے مطالعہ میں ایک Integrated یعنی امتزاجی رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے جسے میں سائنسی طریق کار کہتا ہوں۔ انہوں نے نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ اگر ایک طرف مثنوی کے فن، اس کی روایت اور اس عہد کے اہم مثنوی نگاروں کے اسالیب فن سے میر کا موازنہ کیا تو دوسری جانب ایک باب میں اس عہد کی تہذیب و معاشرت کے حوالوں سے بھی میر کی انفرادیت کو سمجھا۔ پھر موضوع اور متن کے لحاظ سے میر کی مثنویوں کو تین چار حصوں میں تقسیم کر کے عملی جائزہ لیا جس میں تقابل کے ساتھ متن کا تجزیہ بھی شامل ہے۔ اس عمل میں تحقیق اور تنقید دونوں کسی خاص کاوش کے بغیر گلے ملتے نظر آتے ہیں اور حیرت اس پر ہوتی ہے کہ دوسرے میر شناسوں کے علی الرغم وہاب کے یہاں میر کی شخصیت اور شاعری سے مرعوبیت اور عقیدت کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ وہ ایک غیر جذباتی اور معروضی نظر سے کام لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ اسی نوع کا سائنسی رویہ ان کی دوسری تصانیف مثلاً ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری'' میں بھی نظر آتا ہے۔ جس کے پیش لفظ میں قاضی عبدالودود جیسے محقق نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وہاب صاحب نے اپنے مطالعہ میں موضوع کا حق ادا کیا ہے۔ یعنی علمی غیر جانبداری اور منطقی استدلال سے کام لیا ہے۔ جن حضرات کی نظر سے یہ تحقیقی مقالہ گزرا ہے اور اس کی تصنیف سے جڑے بعض متنازعہ مباحث کا جن کو علم ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاب نے کسی دباؤ کے آگے سر نہیں ڈالی اور وہی لکھا جسے انہوں نے ذاتی تحقیق کے نتیجہ میں صحیح سمجھا۔ دراصل تحقیق اور تنقید کے امتزاج، دونوں کی اقدار و معیار کا احترام اور ایسی غیر جانبداری کو قائم رکھنا، ایسا لگتا ہے کہ ان امور کی تربیت وہاب صاحب کو ابتدا ہی میں مل گئی تھی۔ وہاب کی ادبی شخصیت کا یہ ایسا پہلو ہے جس کی قدر میرے دل میں ہمیشہ رہی ہے۔

علم و ادب یعنی کتابوں سے باہر کی دنیا میں بھی جہاں تک تہذیبی، مجلسی اور انسانی رشتوں کا تعلق ہے کم از کم میں نے وہاب کو کھرا پایا۔ عجیب بات یہ ہے کہ میرے وہ احباب جو وہاب کے نکتہ چیں رہے ہیں انہوں نے بھی وہاب کی ذات پر کبھی کوئی عامیانہ الزام عائد نہیں کیا۔ بلکہ اکثر

دوست اس کی بشری اور اخلاقی خوبیوں کے معترف رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں یوں تو کئی واقعات یاد آتے ہیں لیکن ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر ضرور کروں گا۔

ہوا یہ کہ اردو کے ایک جانے مانے پروفیسر اپنی ایک تازہ تصنیف لے کر میرے پاس آئے۔ وہاب صاحب اس وقت میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے پروفیسر صاحب کی کتاب ہاتھ میں لی اور اس کے دیباچہ کو آنکھیں گڑا کر دو چار منٹ پڑھا۔ پھر کتاب بند کر کے رکھ دی۔ اچانک اس کی چمکتی، ناچتی ہوئی آنکھوں نے میری طرف دیکھ کر ایک ٹھمکی لگائی۔ میں سہم گیا کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ دیباچہ میں نے بھی پڑھ ڈالا تو اندیشہ صحیح نکلا۔ ہر صفحہ میں یہاں وہاں کی بڑی سنگین غلطیاں تھیں۔ (جو یقیناً کتابت کی نہیں تھیں) لیکن ہم دونوں نے پروفیسر صاحب کو یقین دلایا کہ یہ کتابت کی غلطیاں ہی ہوں گی۔ اس لئے پورے دیباچہ کی کتابت دوبارہ کرائیے اور بائنڈنگ اگر ابھی تک پوری نہ ہوئی ہو تو رکوا دیجئے۔ پروفیسر موصوف نے ایسا ہی کیا۔

دوستوں سے معاملات میں وہاب اشرفی کا یہ ہمدردانہ اور مخلصانہ رویّہ ہمیشہ مجھے اچھا لگا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دوستوں کی غیبت اور بدخواہی میں، میں نے انہیں کبھی ملوث نہیں پایا۔ البتہ کسی دوست کے اعمال نامہ میں کہیں کچھ سیاہ دھبّے نظر آتے تو ایک دو جملوں میں اس کی طرف اشارہ کر دیتے لیکن اس کی وجہ سے اس کے کردار کی بابت کوئی اخلاقی فتویٰ دینے سے گریز کرتے۔

مجھے احساس ہے کہ وہاب صاحب کی تلاش کا یہ عمل بالکل ادھورا ہے۔ اس لئے بھی کہ وہاب کی زندگی سوچ، مطالعہ اور ادبی شعور واحساس میں جو لہریں اٹھتی ہیں، جو مدوجزر رہوتا ہے اس سے میری مستقل شناسائی کا کوئی معتبر وسیلہ نہیں ہے۔ پھر بھی میری کوشش تو جاری رہے گی بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔

محمود ہاشمی

شاخِ تازہ تر ماند

ایک ایسے عہد میں جب اردو تنقید، اپنی بلوغت کی منزلوں میں ہے، اور جدید تر مکاتب فکر اور مختلف ناقد اپنے نقطۂ نظر کی انفرادیت کے ساتھ شعر وادب کی تفہیم وتعبیر میں مصروف ہیں، تنقیدی مضامین کے کسی معیاری مجموعہ کی اشاعت سے تازہ کار سوالات کا ایک نیا باب وا ہو جاتا ہے۔

وہاب اشرفی کا زیر نظر مجموعہ ''آ گہی کا منظر نامہ'' بھی ادبیات سے متعلق نئے سے نئے سوالات کا پیش خیمہ ہے۔ اس مجموعہ میں ادبی نظریات پر، ادبی مسائل پر اور جدید افسانے کے فن پر کئی ایسے مضامین شامل ہیں، جن سے نئی بحثوں کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ اور عرصہ سے جاری وساری بحثوں میں نئے نکات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان مضامین کے ذریعہ ادب کی تفہیم نیر اقداری فیصلوں کے ضمن میں کچھ نئے ضابطے بھی سامنے آتے ہیں۔

اس سے قبل وہاب اشرفی کے مضامین کا مجموعہ ''معنی کی تلاش'' شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں بھی بنیادی اہمیت کے مضامین شامل تھے۔ ''معنی کی تلاش'' کے دیباچے میں وہاب اشرفی نے اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا

- ''میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کا وسیع مطالعہ ہی کسی نقاد کی نگارشات کو وقیع بنا سکتا ہے''۔
- ''میں ادب کو پروپگنڈہ نہیں سمجھتا۔ نہ ہی میں اسے کسی سیاسی منشور کا ترجماں مانتا ہوں۔ اقتصادیات سے ادب کو بیر نہیں ہے۔ لیکن ادب اقتصادی مسائل کی کھتونی نہیں۔ نہ ہی یہ جنسیات کا پشتارہ ہے۔ ادب کی ایک ہی منطق ہے، اور وہ ہے جمالیات کی۔ کوئی موضوع اپنے آپ میں وقیع نہیں۔ فن کار کا احساس جمال اسے وقیع بنا دیتا ہے۔ اس لئے میری نگاہ میں کسی ادب پارے میں ''کیا کہا گیا ہے'' اتنا اہم نہیں جتنا'' کیسے کہا گیا

ہے" اہم ہے"۔

وہاب اشرفی کے اس اعتراف اور زیر نظر مجموعہ کے مضامین سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اشرفی، ہر ایک ادبی تخلیق کے انفرادی وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر تخلیق کی اپنی مخصوص کائنات ہے۔ جس کا رشتہ عام طور پر طے شدہ یا دریافت شدہ کائنات سے نہیں ہے۔ وہ ہر فن پارے میں ایک نامیاتی وحدت کو تلاش کرتے ہیں۔ ان عناصر کا محاکمہ کرتے ہیں جو اُس نامیاتی وحدت کی تشکیل میں معاون ہوں، اور فن پارے سے مکمل مفہوم کی بازیافت کے لئے اسلوب اور ہیئت کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں۔ منٹو کے افسانے "پھندنے" کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ بعض اوقات کسی تخلیق کی ظاہری ہیئت اور لفظیات سے زیادہ اس کا آہنگ، اسلوب اور ہیئتی سانچہ تشکیل معانی میں معاون ہوتا ہے۔ اور زبان کا استعاراتی یا علامتی اسلوب وسیع تر مفہوم کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں

> "پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ اس میں (پھندے میں) شاید پہلی بار منٹو نے لفظ کو معنی کے خلاف استعمال کیا ہے۔ دوسرا نکتہ جو بہت واضح ہے وہ یہ ہے کہ اس نے عمومی ادبی زبان یعنی روایتی ادبی زبان سے روگردانی کی ہے، اور یہ دونوں نکتے ایسے ہیں جو اشاریت کو اشاریت بنانے میں معاون رہے ہیں۔ ان امور کے علاوہ "پھندنے" میں آزاد تلازمے چھلانگ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ شعور کی لہروں کا سا کیف حقیقتاً آزاد تلازموں نے داخلی ماجرا سازی کے لئے زمیں ہموار کی ہے۔"
>
> (علامت اور منٹو کا افسانہ پھندنے)

وہاب اشرفی کا یہ طریقِ نقد، جدید تر مغربی تنقید کے ہیئتی اسکول کا خوشہ چیں ہے۔ اس طرزِ فکر کے مطابق ادب کا اقداری سطح پر اعلیٰ مقام اس کی ادبی اور ہیئتی خصوصیات پر منحصر ہے نہ کہ ادب کے غیر ادبی معیارات پر۔

چنانچہ وہاب اشرفی نے ادب کی تفہیم کے لئے پیش پا افتادہ نظریات کو بنیاد بنانے کی بجائے تخلیق کی داخلی اور خارجی ہیئت، نیز متن کے مطالعہ کو از بس ضروری سمجھا ہے اور مغربی ناقدوں کے اصول وضوابط سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاعر اپنی تخلیق میں جذبات اور شخصی اثرات اور نظریات سے فرار حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ شاعر کی سوانحی اور نحو تفصیلات اور اس کے عمومی نظریات کی بجائے، اس کی تخلیق کے کرافٹ (Craft) کا جائزہ لینا چاہئے۔ تا کہ یہ

ظاہر ہو سکے کہ فنکار خود کو پوشیدہ رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ یا جدید تنقید کے اس اصول کی بنیاد پر وہاب اشرفی نے حمیل مظہری کی غزلوں کے آہنگ اور شعری ہیئت کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ شخصی سطح پر اقبال کے خلاف نبرد آزما رہنے والے حمیل مظہری، لاشعوری طور پر اقبال کی شاعری سے اسی حد تک متاثر ہیں کہ ان کی بیشتر غزلوں کا آہنگ اور لفظیات سراسر اقبال کی خوشہ چینی ہیں۔

وہاب اشرفی کے وہ مضامین جو جدید افسانے سے متعلق ہیں، اور اس مجموعہ میں شامل ہیں، ان میں بھی افسانوں کو سماجی تناظر کی بجائے فن پارے کی سطح پر پرکھا گیا ہے۔ اور تخلیق کی مکمل Structure سے مستفید ہونے کے لئے افسانوں کے علامتی تناظر کو نمایاں کیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جدید افسانے کی توجیہات میں ''تجریدی اور علامتی'' افسانوں کو یکسر ایک ہی شئے تصور کر لیا تھا۔ وہاب اشرفی نے ان کی کوتاہی اور کم نگاہی کی بھی بڑی بھرپور گرفت کی ہے۔

جدید افسانے سے متعلق مضامین کے علاوہ اس مجموعہ کے اہم ترین مضامین میں سے دو مضامین کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو ''کلامِ اقبال کے نثری معانی'' سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں وہاب اشرفی نے ایک ایسا نازک اور اہم سوال اٹھایا ہے جس کا رشتہ ہم عصر تنقید کے اس مکتب فکر سے بھی ہے جو شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔ فاروقی نے ''تفہیم غالب'' کے طویل سلسلے میں نہ صرف غالبؔ کے ان شارحین سے اتفاق یا گریز کیا ہے جو شعر کو نثری مفہوم کی بنیاد پر سمجھتے سمجھاتے رہے ہیں، بلکہ خود فاروقی نے بھی نثری معانی یا نثری منطق کو استعمال کرنے سے احتراز نہیں کیا ہے۔ شاعری کو نثری بنیادوں پر پرکھنے کی اس روش کے خلاف وہاب اشرفی نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہے جو ممتاز صاحب جمال مغربی ناقد Sosan Sontag کا ہے، اور جسے اس نے اپنی کتاب "Against interpratation" میں بیان کیا ہے۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں

> ''میرا خیال ہے کہ شاعری کے نثری معانی تک پہنچنے کی کوشش ایک فعل عبث ہے اور نثری معانی کی بنیادوں پر کسی شاعر کی عظمت کا فیصلہ غیر مستحسن بھی ہے اور غلط بھی۔ نثر کے تقاضے اور ہیں، شاعری کے اور۔ ان کی کارکردگی بھی قطعی مختلف ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات واضح ہے کہ شعر نثر اسی وقت بن سکتا ہے جب وہ اپنے مخصوص تقاضے سے دست بردار ہو جائے اور مخصوص کارکردگی کو بالائے طاق رکھ دے۔ نثر کی غایت، محض

مفہوم کی اکہری ترسیل ہے جب کہ شاعری پیچیدہ اور تجریدی عوامل کا مجموعہ ہے''۔

(کلام اقبال کے نثری معانی)

وہاب اشرفی کا یہ مضمون صرف اس لئے اہم نہیں ہے کہ انہوں نے شاعری کو نثری منطق سے آزاد کرانے اور مقصود بالذات ماننے کی تاویل پیش کی ہے۔ بلکہ اس مضمون کے ذریعہ انہوں نے کلیم الدین احمد کے تنقیدی نظریات سے مبارزطلبی کی ہے، اور کلیم الدین احمد کی خودسرانا عدم آگہی اور اس کے نظریہ تفہیم شعر کی بنیادی کوتاہی کی جانب انتہائی جرأت مندانہ انداز میں اشارہ کیا ہے

- ''میرے خیال کو تقویت مشہور نقاد کلیم الدین احمد کی نئی اور مفصل کتاب ''اقبال-ایک مطالعہ'' سے بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس کتاب میں شعر اقبال کے نثری معانی کے حصول سے اس عظیم شاعر کے بارے میں جو نتائج اخذ کیئے گئے ہیں وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور مضحکہ خیز بھی''۔
- ''جاوید نامہ اور ڈوائن کامیڈی کے موازنے میں کلیم الدین احمد، شعری محاسن یعنی فنی نکات، مثلاً تشبیہہ کی ندرت، استعارے کا نظام، ترنم، موسیقی، آہنگ، پیکروں کے عمل، یعنی حسّی کیفیات، متھ میکنگ وغیرہ سے خال خال تعلق رکھتے ہیں اور ڈوائن کامیڈی کے کبھی منظوم اور کبھی نثری ترجمے کو سامنے رکھ کر خیالات کی نثری تشریح میں لگ جاتے ہیں''۔
- ''دراصل کلیم الدین احمد نثری ابلاغ کے اصولوں پر شعر کے نفسِ مضمون تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ کار ہمیشہ گمراہ کن رہا ہے''۔

(کلام اقبال کے نثری معانی)

وہاب اشرفی نے کلیم الدین احمد کی جو گرفت کی ہے، وہ نہ صرف یہ کہ بے حد معقول اور بھرپور ہے، بلکہ دلائل سے بھی اسے ثابت کیا ہے۔ مذکورہ مضمون کے علاوہ زیر نظر مجموعہ میں شامل وہاب اشرفی کا مضمون ''اردو تنقید کی نئی صورت حال'' بھی کلیم الدین احمد کے ان نظریات پر تیشہ زنی کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے باعث ایک زمانے تک کلیم الدین احمد اردو تنقید کا گوتھک طرز کلیسا بنے رہے۔ مذکورہ دونوں مضامین کے مطالعہ سے مجھے اس لئے بھی طمانیت ملی کہ خود وہاب اشرفی بھی کلیم الدین احمد کے سحر سے آزاد ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین کا سابقہ مجموعہ ''معنی تلاش'' ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کا انتساب کلیم الدین احمد کے نام کیا گیا تھا۔

''پروفیسر کلیم الدین احمد کے نام

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر

کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی''

وہاب اشرفی کا زیر نظر مجموعہ ۱۹۸۸ء میں مرتب ہوا ہے۔ دس برس کے اس عرصہ میں وہاب اشرفی کو اندازہ ہو چکا ہے کہ زندگی کے ضمیر کا انکشاف کرتے ہوئے کلیم الدین احمد کے ساز نے جو مضرابی کی تھی، اس کے بہت سے تار فرسودہ بھی ہیں، خود ساختہ بھی، اور فطرت کے آہنگ سے بے خبر بھی۔ دس برسوں میں وہاب اشرفی نے بین الاقوامی ادب کا مزید مطالعہ کیا ہے، اور ان نکات کی تفتیش بھی کی ہے، جنہیں کلیم الدین احمد پیش کرتے رہے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے سلسلے میں وحید اختر کے علاوہ ابھی کسی دوسرے ناقد نے وہاب اشرفی کی طرح مستحکم دلائل کے ساتھ و اہموں کے ازالہ کا اہتمام نہیں کیا ہے۔

''سوغات'' کے زمانے میں محبوب خزاں کو یہ شکایت تھی کہ شمالی ہند کے ادیب بہار کی گراں قدر ادبی تحصیات کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور کلیم الدین احمد کے علاوہ کسی دوسرے ادیب یا ناقد کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ بعد میں مظہر امام نے بھی اپنے ایک مضمون میں بہار کے نئے ادیبوں کے سلسلہ میں یہی شکوہ کیا تھا، اور ایک بار پھر کلیم الدین احمد کا نام لیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ بہار کے سب سے معقول ناقد وہاب اشرفی نے خود یہ تیشہ اٹھایا ہے، اور اس طرح بہار کی ادبی روایات کو بلوغت کی منزلوں سے ہم کنار کیا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر وہاب اشرفی سے صرف ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے غالباً آئی اے رچرڈس یا پھر شمس الرحمٰن فاروقی کی ہم نوائی میں ایک جانب تو تنقید کی زبان میں خطابت سے گریز کیا ہے اور دوسری جانب اپنے نثری اسلوب سے بلاغت اور لطافت کو بھی خاصے فاصلے پر جامد کر دیا ہے۔ تنقید کی زبان میں شگفتہ اسلوب کی تائید کرنے کے باوجود وہ وارث علوی کے اسلوب کو ''بھانڈوں کی نقل'' قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے وہاب اشرفی کا جامعاتی ذہن اور جامعاتی حیثیت، انہیں تنقید میں بے محابا، آزادانہ رویہ اور اسلوب اختیار کرنے والوں سے بدظن کرتا ہو۔ لیکن حسن عسکری کے تنقیدی رویے، طرز نگارش اور اسلوب کو قابل داد سمجھنے کے بعد۔ وارث علوی کے اسلوب کو جارحانہ اور عامیانہ قرار دینا خود ایک تضاد کو پیش کرتا ہے۔ وہاب اشرفی نے اردو کے کلاسیکی ادب، دکنی ادب اور عالمی ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ اپنی مستقل تصانیف کے ذریعہ اردو کے طالب علموں کو عظیم تر روایت سے باخبر بھی کرایا ہے۔ اس وسیع تناظر اور منظر نامے میں جارحانہ رویوں کی ایک بڑی وسیع کائنات موجود ہے اور اسے

تسلیم بھی کیا گیا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہاب اشرفی اپنے آئندہ مجموعۂ مضامین میں، وارث علوی والے اسلوب کے ذائقہ میں ایسے پڑھنے والوں سے مخاطب ہوں۔ وہاب اشرفی کے موجودہ عالمانہ اور عارفانہ اسلوب اور حوالہ جاتی تاویلات میں کبھی کبھی مجھ جیسے قاری پر استدلال اور دلیل کا حوا اثر ہوتا ہے اس میں جمالیاتی لطافت کی جگہ علم کا رعب زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ وہاب اشرفی سے کہوں کہ "پارٹنر" ایک بار پھر ٹرسٹرم سینڈی بن جاؤ۔

یہ شکایت یا مطالبہ ذاتی نوعیت کا ہے۔ کیوں کہ وہاب اشرفی میرے ہم عصر بھی ہیں اور دوست بھی۔ لیکن یہ ہمارے عہد کی سچائی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے انتہائی قربت رکھنے کے باوجود بھی، ادبی موضوعات اور نظریات میں باہمی اختلاف کو مٹاتے نہیں بلکہ قائم رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علم وفن کے اس تارہ کار عہد میں وہاب اشرفی نے علمی اور ادبی رواداری کے ساتھ اردو تنقید میں جس دبستاں کو فروغ دیا ہے وہ نیا بھی ہے، اور ادبی صداقت کا حامل بھی۔

معاصر ناقدوں کو اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ وہاب اشرفی نے بہار کی انتہائی روایتی فضا میں تنقید کے اس دبستان کی شمع روشن کی ہے جس کی تابانی میں عالمی ادبی روایت کا ایقان حاصل ہوتا ہے۔

عتیق اللہ

وہاب اشرفی کا کُرۂ نقد

تنقید میرے نزدیک ایک خاص تہذیبی مقصد سے عہدہ برآ ہونے کا نام ہے۔ جو کسی بھی ادبی تخلیق کے متداول، جاری اور متعیّن کردہ خصوصی اور عمومی معنی میں کسی نئے معنی کا اضافہ اور اس کی نئی پہچان ہی نہیں کراتی بلکہ اسے موجودہ عہد کی بصیرت کا ایک حصّہ بنانے کی جستجو بھی اس کے بہت سے اعمال میں سے ایک نمایاں عمل ہے۔ تخلیق اپنی بہترین کوشش میں Internalization سے عبارت فن ہے تو تنقید کا بہترین عمل وہیں اپنی بہترین سعادتوں کا مظہر ہوتا ہے جس کی بنیاد Externalization اور Concretization پر ہوتی ہے۔ چیزوں کو بحال کرنا اس کے مقصد سے باہر کی شئے ہے۔ چیزوں کی نئی نسبتیں قائم کرنے اور نئے امتیازات وضع کرنے کے ضمن میں اپنے اختیار اور اپنی توفیق کو ایک نیا نام دینا بھی اس کے منصب میں شامل ہے۔ ہر ادبی متن کی اپنی ایک خود کار و خود روانا ہوتی ہے جسے تنقید بار بار شکست دینے کے درپے ہوتی ہے۔ اسی شکست میں متن کی فتح کا راز بھی مضمر ہے اور متن کی کوکھ سے ہر بار ایک نئے متن کے وقوع ہونے کی صورتیں بھی تنقید کی اسی نوع کی سرگرمی میں پنہاں ہیں۔ تنقید نگار کا ذہن اور تصوّر ہی صاف نہیں ہے اور تجزیے کو راس آنے والی مناسب علمی زباں پر بھی اسے کوئی خاص دسترس نہیں ہے یا وہ نثر کے اس جوہر ہی سے آگاہ نہیں ہے جس کا مقصد اطلاق کے لمحوں میں چیزوں کو زیادہ سے زیادہ کھولنا اور ایک مختلف طور پر قائم کرنا ہوتا ہے تو یہی بہتر ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ تنقید کے کام سے دستبردار ہو کر ایسا کوئی کام کرے جو ادب کے حق میں کم سے کم نقصان دہ اور خود اس کے حق میں زیادہ سے زیادہ نفع بخش ثابت ہو سکے۔

محولہ طول طویل تمہید باندھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہاب اشرفی کے گذشتہ ۳۵-۳۰ برسوں پر پھیلے ہوئے مطالعات کو میں کوئی ایسا نام دے سکوں جس سے وہاب فہمی کا میرا مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے اور اسی حوالے سے میں اس ذہن کے عمل کو سمجھ سکوں اور سمجھا بھی سکوں جو

اپنی رایوں اور آگاہیوں میں قدرے شفاف ہے۔ فی زمانہ اردو تنقید سے شفافیت کی صفت ناپید ہوتی جا رہی ہے، جو اکثر ((نام نہاد) دانش کے غیر معمولی بوجھ تلے دبی کچلی محسوس ہوتی ہے یا ایسے ترجمے کا تاثر فراہم کرتی ہے جو ذہن کے محسوس تجربے کے بجائے لغت کے وسیلے سے غیر معمولی علمیت وفضیلت کے مغالطے کا شکار بنا دیتی ہے۔ اپنے ذہنی تجربے اور Responses کو مناسب نام دینے کے لئے بھی کم از کم اپنے عہد کی معیاری علمی زبان کا شعور ضروری ہے اس لحاظ سے وہاب اشرفی کی سب سے بڑی خوبی افہام وتفہیم کے تعلق سے شفافیت ہی نہیں بلکہ ان کی نثر کا وہ جوہر بھی ہے جو ان کے مطالعات کے زاویوں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر کے دکھاتا ہے۔

وہاب اشرفی نے ایک جگہ لکھا ہے

''کسی بھی شاعر یا فنکار یا دوسرے شاعر کی اہمیت واضح کرنے سے پہلے نقاد پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ واضح کرے کہ اس کے پاس پرکھ کے معیار کیا کچھ ہیں؟ تنقیدی کسوٹی کیا ہے؟ استدلال کن بنیادوں پر قائم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے امور ہیں جن سے کسی فن پارے کی بنت میں اترنے کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ ورنہ رائے محض تو کوئی بھی قائم کر سکتا ہے، اس میں تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کی کیا ضرورت ہے؟ گویا سب سے پہلے نقاد کو خود اپنی تنقید کی بوطیقا سے واقف ہونا چاہئے، پھر اسے اس کے نکات کی عملی صورت اجاگر کرنے پر قدرت بھی، تب ہی تنقیدی وقار حاصل ہو سکے گا، تنقید رائے زنی نہیں ہے، نکتہ رسی اور نکتہ شناسی ہے، اور یہ مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ اس کے مطالبات بہت کچھ ہیں''۔

محولہ بالا اقتباس میں چار باتیں اہم اور بنیادی ہیں

(الف) کسی فن پارے کی بنت میں اترنے کا راستہ کیوں کر ہموار ہو سکتا ہے؟

(ب) نقاد کو اپنی تنقید کی بوطیقا سے واقفیت ضروری ہے۔

(ج) پھر اس بوطیقا کے نکات کی عملی صورت اجاگر کرنے پر اسے قدرت ہونی چاہئے۔

(د) تنقید محض رائے زنی نہیں ہے بلکہ نکتہ رسی اور نکتہ شناسی ہے جو نسبتاً ایک مشکل ترعمل ہے۔

وہاب اشرفی کے نزدیک نقاد کی اپنی ایک بوطیقا ہوتی ہے یا ہونی چاہئے جو اس کے حق میں یا افہام وتفہیم کی راہ میں رہ نما اصول کے طور پر کام آتی ہے یا اسے کام آنا چاہئے ورنہ بقول ان کے ''مختلف مکتبہ فکر کا امتزاج عجز تنقید ہے، وسعت نہیں۔'' پھر ان کا یہ خیال بھی خاصا اہمیت رکھتا

ہے، بالخصوص وہاب صاحب کے طریق تنقید کے باب میں، کہ نقاد کو اپنی بوطیقا کے اطلاق پر قدرت ہونی چاہئے۔ یعنی وہ قوت جو خود وہاب اشرفی کی تنقیدی زبان کی ایک خاص صفت ہے اور جس کے بعد ہی میرے نزدیک شفافیت کی راہ بھی وا ہوتی ہے۔

تنقید کے عمل میں، محض ایک بندھے ٹکے اصول یا اصولوں کے اخذ کردہ مجموعے پر ایک بڑی مدّت تک کاربند رہنا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دعویٰ تو کیا جا سکتا ہے لیکن عملاً اس پر قائم و برقرار رہنا تخلیق کی خودرائی کے منافی ہے۔ وہاب صاحب کی بیش تر تنقید میں ان کا ایک خاص، جچا تلا نقطۂ نظر، یکساں روی کے ساتھ عمل آور ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے، بالخصوص ایک ایسے نقاد کے یہاں یہ چیز حیرت میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے جس کی تنقید کی تاریخ گذشتہ کم و بیش چار دہائیوں پر محیط ہے۔ تاہم ادبی متن چوں کہ ہر بار ایک نئے چیلنج کے طور پر متعارف ہوتا ہے اور وہ مختلف اوقات میں مختلف ذہنوں کا خلق کردہ ہوتا ہے، لہذا ہمیشہ تنقید یا نقاد کے اپنے تقاضوں کی دہلیز پر تخلیق کے اپنے تقاضوں کو قربان کرنے کے عمل کو زیادہ مستحسن بھی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ وہاب اشرفی کے دعوے سے قطع نظر ان کے مشتملات پر ایک نظر ڈالی جائے۔ اور ان کے طرز تنقید پر غور کیا جائے تو جہاں ان کے قدر شناسی کے رویّے میں یکسانیت پائی جاتی ہے وہیں تنوع کی بھی کمی نہیں ہے۔

وہاب اشرفی ایسے نقاد ہیں جنہیں جدیدیت کے بیشتر رویّوں سے اتفاق تھا باوجود اس کے ترقی پسند ادب کے بہتر اور منتخب مثالوں کو بھی وہ وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو ہیئت کے مقابلے میں مواد پر بنائے کار رکھتا ہے۔ شاعری میں استعارے سے ایک نسبت خاص کے باوجود لفظ و معنی کی یگانگت سے زیادہ عزیز ہے حتیٰ کہ شعور و تعقل کے برخلاف لاشعور کے ایسے کسی عمل پر اس کا یقین کم سے کم ہے جو ابہام کو منتج ہوتا ہے۔ حالانکہ جدیدیت میں ابہام کے دوسرے معنی تکثیر معنی ہی کے تھے۔ لیکن معنی کی حیثیت مستقلاً گریز کی نہیں تھی۔ جب کہ جدیدیت اور ترقی پسندی دونوں کے ماب میں بہر حال کسی ایک اور حتمی معنی تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

جدیدیت کے اس طول طویل سفر کے بعد وہاب اشرفی جب اکیسویں صدی کے دہانے پر ہوتے ہیں تو مابعد جدید تصوّرات میں بھی انہیں بہت کچھ relevent، امکان افزا اور امید افزا دکھائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں تفہیم غالب کے نئے ممکنہ جہات، ساختیات اور پس ساختیات اور گوپی چند نارنگ کی ساختیات شناسی سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نیا سے نیا ادبی تصوّر وہاب صاحب کی کمزوری ہے۔ وہ اخذ و قبول میں کبھی بخل نہیں برتتے بشرطیکہ وہ ان کے

معیار کی سطح سے مطابقت رکھتا ہو" معنی کی تلاش" کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا ہے

"میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہتریں ادب کا وسیع مطالعہ ہی کسی نقاد کی نگارشات کو وقیع بنا سکتا ہے، ورنہ مقامی روایات کی زنجیر میں جکڑا ہوا پس ماندہ ادب اسے ہمیشہ عظیم نظر آئے گا اور پھر اس کی رائے اور تجزیے کے نتیجے میں جو ادب پیدا ہوگا، وہ بھی یقیناً گھٹیا اور بے وزن ہوگا۔ ایسی صورت میں مغربی شعر و ادب اور تنقید کی طرف بار بار مڑ کر دیکھنا کتنا ضروری ہے۔"

موجودہ وقتوں میں محولہ بہت سی باتوں پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ مثلاً اب آفاقیت جیسا تصوّر تقریباً اپنے معنی کھو چکا ہے اسی طرح وہاب اشرفی کے اس خیال کی بھی اب کوئی معنویت باقی نہیں رہی کہ مقامی روایات کی زنجیر میں جکڑا ہوا ادب پس ماندہ ہوتا ہے۔ Orientalism کے دعویداروں نے دیسی اور مقامی تہذیبوں کا جو تصوّر دیا ہے مجھے اس میں بھی بہت سے خطرات دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو سب سے بڑا خطرہ احیا پرستی اور بنیاد پرستی سے وابستہ ہے۔ اس قسم کے رجحانات ہی نوع انسان کو ارتقاء کی سمت لے جانے کے بجائے ظلمت کے گہرے غاروں میں دھکیل رہے ہیں بلکہ ذات، نسل اور زبان کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر تشدد اور خون خرابے کی فضا کو بھی تیز تر کر رہے ہیں۔ وہاب اشرفی کے اس خیال سے تھوڑی سی تحریف کے ساتھ میں پوری طرح متفق ہوں کہ مغربی شعر و ادب اور تنقید سے ہمیں اپنی معاملت کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں محض مغربی کے بجائے دیگر زبانوں کا پیوند لگانے سے بات زیادہ بامعنی ہو سکتی ہے۔ کہنے کا مقصود یہ کہ وہاب صاحب نے اپنے اطراف کو کھلا رکھا ہے۔ انہوں نے ہر نئے رجحان سے کچھ نہ کچھ سیکھا ضرور ہے اور پھر اس کا بخوبی اطلاق بھی کیا ہے۔

وہاب اشرفی کی تنقید، اطلاقی تنقید کا ایک بے حد جامع تصوّر مہیا کرتی ہے۔ تصوّرات پر انہوں نے مباحث بھی بہت کئے ہیں، گفتگو بھی بے حد کی ہے اور گفتگو کو انہوں نے کئی بار مناظرے میں بھی بدلا ہے۔ لیکن ان ادبی رجحانات، تحریکات اور تصوّرات کے بارے میں علیحدہ سے بہت کم اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کی کوشش کی ہے۔ جن کا اطلاق وہ شاعری اور فکشن دونوں زمروں میں یکساں کرتے رہے ہیں بلکہ مجھے ان کی تنقید کی قوّت کا بہترین صرف ان کے طریق اطلاق ہی میں دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اپنے مضمون کے ابتدائی حصّہ میں وہاب اشرفی کے ایک اقتباس سے چار اہم اور بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی، اس کی پہلی شق بابت الف کے تحت کسی فن پارے کی

ست میں اترے کی بات کہی گئی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہاب صاحب کی ذہنی تربیت میں جدیدیت کے بہت سے تصورات بالخصوص لفظ و ہیئت سے متعلق تصورات نے اہم حصہ لیا ہے۔ جدیدیت نے قرأت بغور (کلوز ریڈنگ) طریقے کو ادبی متن کی گرہ کشائی اور معنی کشائی کے ذیل میں ایک خاص اہمیت دی تھی۔ وہاب اشرفی کے طریق اطلاق کی جسے نمایاں صفت کہنی چاہئے۔

میں Georges Poulet کی اس رائے سے قطعاً متفق نہیں ہوں کہ مصنف کے فہم و خیال سے ہم آہنگی قائم کئے بغیر تنقید نگار اس Intimacy کا دعویدار ہی نہیں ہوسکتا جو اس کے نزدیک تنقید کے لئے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ بجائے اس کے میرا خیال ہے کہ مصنف کے شعور سے ہم آہنگی محض ایک بھرم ہے۔ وہاب صاحب کی ترجیح بھی متن کی بنت میں اترے پر ہے، جو ایک نسبتاً زیادہ بہتر تنقیدی طریق کار ہے۔ وہاب صاحب کا خاص معاملہ بھی متن کی وجودیات (اونٹولوجی) سے ہے، اتنا ہی نہیں متن (جیسے غالب، اقبال، جوگندر پال اور غیاث احمد گدی وغیرہ کے متون) ان کے فکر و احساس اور ان کی اس شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے جس کے لاشعور میں لسان اور ادبی روایت کی تاریخ کی جڑیں بہت گہرائی سے پیوست ہیں۔ جنہیں لمحۂ موجود میں نیز متون کے متضاد تقاضوں کے جبر کے تحت ذہن سے جھٹکنے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچ رہتا ہے اور یہی بچا کھچا مواد کسی نہ کسی سطح پر وہاب اشرفی کو اپنے ماضی سے بھی جوڑے رکھتا ہے۔

وولف گینگ آئزر نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ادبی کارنامے کے دو کرّے ہوتے ہیں، ایک فنّی کرّہ (وہ متن جو مصنف کا زائدہ ہے) اور دوسرا جمالیاتی کرّہ (وہ تصور ریذیری جس کا تعلّق قاری سے ہے)۔ اس معنی میں دونوں زمروں کے مابین ایک حرکی رشتہ ہے۔ متن کی وجودیات بھی حرکی ہے، اس معنی میں کہ نقاد یا قاری کا تفاعل بھی اس میں شامل ہے اور جمالیاتی Responses کی اضافیت خود ذہنی سرگرمی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔

وہاب اشرفی اپنے اطلاق میں زیرِ تحریر موضوع کے اکثر کسی ایک پہلو کو بنیاد بناتے ہیں تاکہ کسی ایک پہلو سے وابستہ دیگر متعلّقات کے ساتھ مناسب انصاف کیا جا سکے نیز تعبیرات کے انبوہ کثیر میں خواب کی وحدت اور مرکزیت تہس نہس نہ ہو جائے۔ یہ چیز ان کے اکثر مضامین کے عنوانات سے بھی واضح ہے۔ جہاں عنوان، مظہر کا کام نہیں کر رہا ہے وہاں بھی عملاً ان کے مطمحِ نظر محض کوئی ایک ایسا اہم اور بنیادی پہلو ہی ہوتا ہے جس میں صاحب موضوع کی شناخت کے زیادہ

سے زیادہ زاویوں کے نمایاں ہونے کا امکان مخفی ہوتا ہے۔

''شعرِ اقبال کا علامتی پہلو'' میں ان کی توجیہات اور ان کے دلائل کم توجہ طلب نہیں۔ علامت پر ایک تفصیلی بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

- ''اقبال کی کوئی نظم علامتی نہیں ہے''۔
- ''اقبال کی بیشتر نظموں میں عضویاتی تکمیل خوبصورت استعاراتی نظام اور غیر معمولی قوّت حاسہ کے حامل پیکروں کے باوجود وہ سرّیت اور ابہام نہیں جو علامتی نظموں کو معنی کے ایک سیلاب کی زد میں لا کھڑا کرتا ہے''۔
- ''اقبال کی نظموں میں مجازی مفہوم کا بھی تعیّن ممکن ہے اور ایسا مفہوم سیاق و سباق کا مرہونِ منّت ہوتا ہے''۔
- ''اقبال کے یہاں تمام کی تمام علامتیں مثلاً عشق، عقل، دل، تقدیر وغیرہ تیز شعوری ادراک کا نتیجہ ہیں''۔

وہاب اشرفی نے مذکورہ بالا مضمون کے ذریعے ان نقادوں کو ازسرِ نو غور کرنے پر اُکسایا ہے جو علامت کے کردار سے واقفیت یا عدم واقفیت کی بنا پر اقبال کو علامتی شاعر ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ علامتی شاعر نہ ہونے کے باوجود اقبال اپنے موجودہ کینوس میں بھی کم وسیع المظاہر نہیں ہیں۔

''اردو نثر کی روایت اور غالب کی انشاپردازی'' میں پہلے ایک پس منظر کے طور پر اردو نثر کی اس روایت کو اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا ایک سلسلہ دکن سے شروع ہوتا ہے اور جو مذہبی اور متصوفانہ جذبوں اور علم کی نمائندگی کرتا ہے۔ دوسرا سلسلہ شمالی ہند میں سراج الدین علی خاں آرزو، اور سودا سے ہوتا ہوا فورٹ ولیم اور فورٹ ولیم سے ہوتا ہوا عہد غالب کی نثر تک پہنچتا ہے۔ غالب کے اسلوب نثر پر محاکے کی اساس اس خیال پر قائم کی گئی ہے۔

ان (غالب) کا اندازِ بیان حد درجہ بے ساختہ ہے۔ ان کا تعلّق زیادہ تر ذہن کی وقتی لہروں سے ہے جو سطحِ زمین سے منتقل ہو کر نوکِ قلم پر آ گئی ہے۔ ان کے خطوط میں مقالے کی سی سنجیدگی نہیں، ان میں انشائیہ کی ترنگ ہے اس لئے تکلّف کی گھٹی گھٹی فضا کی جگہ ایک گلشنِ شاداب کا سماں ہے۔

دراصل وہاب اشرفی کا خاص منصب غالب کی نثر کے اس تخلیقی جوہر کی دریافت تھا جو نثر اور نثر میں امتیاز قائم کرتا ہے کہ ایک مخاطبے کی نثر دوسرے مخاطبے کی نثر سے کیوں کر اور کن بنیادوں

پر مختلف قسم کا تاثر فراہم کرتی ہے۔ وہاب اشرفی اس افتراق کو زیادہ سے زیادہ استدلال کے طور پر نمایاں کرنے کے لئے غالب اور ابوالکلام آزاد کے خطوط کی نثر کو Juxtapose رکھ کر دونوں کو ایک دوسرے کا نقیض قرار دیتے ہیں اور اس ضد کی بنیاد بھی نثر کا وہ تخلیقی جوہر ہی ہے جو غالب کی نثر کو Fact Oriented ہونے کے باوجود fictional بنا دیتا ہے۔

پریم چند، غیاث احمد گدی، جوگندر پال اور جیلانی بانو کے افسانوی فن پر گفتگو کرتے ہوئے وہ بار باران کے متون ہی کو حوالے کے طور پر بنیاد بناتے ہیں۔ ''پریم چند کے افسانوں میں حقیقت نگاری'' میں درج ذیل خیالات کا اپنا ایک تناظر ہے، پریم چند فہمی میں جس کی اپنی جگہ ایک وقعت اور معنویت ہے۔

- ''پریم چند کے افسانوں سے جہاں دیہات کی زندگی کے معصوم پہلو ابھرے ہیں، وہاں اس کے مناقشے بھی سامنے آتے ہیں''۔
- ''پریم چند نسبی بنیادوں پر برادریوں کی تقسیم کے قائل نہ تھے، خصوصاً وہ برہمنی سماج کے حلاف آوار اٹھانا چاہتے تھے''۔
- ''پریم جند ہمیشہ یہ سوچتے رہے کہ کسان کی گردن سرکار زمیندار کی مٹھی سے کیسے نکل سکتی ہے؟ غالباً ان کے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا، اس لئے کہ اکثر رعایا کساں اپنے زمیندار مالک کے شطرنج کی بساط پر ور یر، رخ، ہاتھی، گھوڑے کے مقابلے میں بے اثر پیدل مہرے تھے''۔
- ''مادھو اور گھیسو کہنے کو انسان ہیں، لیکن بھرے پرے سماج سے مکمل طور پر Alienated ہو چکے ہیں۔ دراصل ان کی بے حسی ڈی ہیو مانائزیشن کا ایک مرحلہ ہے''۔ پریم چند کے باب ہی میں نہیں جوگندر پال، غیاث احمد گدی اور حیلانی مالو کے افسانوی متون کی گرہ کشائی کے دوران وہاب اشرفی یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک Formalist ہیں اور ان کی ترجیحات میں لفظ کے تخلیقی اور سرّی عمل کی حیثیت بنیادی ہے۔ وہ اس کے برخلاف ایک تہذیبی نقاد کے طور پر وہ ایک دوسرے سے متخالف اور متضاد عقائد، درجات، اعمال اور نمائندگیوں کی بھی پردہ دری کرتے ہیں، ان عوامل سے بھی چشم پوشی نہیں برتتے جن کا تعلق سیاست، سماج، تاریخ، اخلاق، اقتصادیات اور نفس انسانی کی کہیں محسوس اور کہیں غیر محسوس سرگرمیوں سے ہے۔ اسی بنیاد پر شولز نے "Textual Power" میں یہ بات کہی ہے کہ متن کے معنی سماجی متن کے ہیں۔ وہ

تنقیدی کارکردگی کو تین نکات پر مشتمل بتاتا ہے۔(۱) قرأت، (۲) تشریح، (۳) تنقید۔ اس کے نزدیک قرأت، اس معنی کی دریافت سے عبارت ہے جن کا انحصار ادبی تاریخی سیاق وسباق پر ہے۔تشریح وہاں واقع ہوتی ہے جہاں قرأت ناکام ہو جاتی ہے۔ جہاں متن کچھ زائد ہوگا اور قاری میں کچھ کمی ہوگی، وہاں بھی جہاں کہنے سے کچھ رہ گیا ہے یا کسی جبر کے تحت دب گیا ہے۔تنقید ادبی متن کی مہر کو توڑ کر اس سماجی متن کو نکال باہر لاتی ہے جو اقدار کی بنیاد پر استوار ہے اور جس کے تنازعات اور صدمات کے کئی کرّے ہیں۔

عیاث احمد گدّی، جوگیندر پال اور جیلانی بانو کے مطالعات ہی میں نہیں ''تشدد، مغربی فکشن اور اردو افسانہ''، ''علامت اور منٹو کا افسانہ'' پھندنے''، ''اردو افسانہ کل اور آج'' وغیرہ میں بھی وہاب اشرفی ایک تہذیبی نقّاد کا رول انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک ایسا نقّاد جو چیزوں کو اس کے ایک خاص تناظر میں دیکھتا اور اُن ذہنی Responses کو بھی ایک خاص قیمت بخشا چاہتا ہے جو خالصتہً انسانی رشتوں کی سنت میں اپنا ایک معنی رکھتے ہیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

وہاب اشرفی کی ناقدانہ شناخت

اردو کی ادبی تنقید کے عروج وزوال کی پوری داستان صحیح معنوں میں محض ایک صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے لے کر ابیسویں صدی کے اواخر تک شعرائے اردو کے تذکروں کی صورت میں جو تنقید ملتی ہے وہ یا تو شعری وادبی تاریخ کا ضمیمہ ہے یا پھر شعرا کے کلام کے انتخاب کے حواشی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ان قدیم تنقیدی تصورات کا کوئی پس منظر ہے تو وہ علم معانی، علم بیان اور مجموعی طور پر علم بلاغت کی عربی اور فارسی روایت کی بازگشت ہے۔ الطاف حسین حالی کی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی تمام حدبندیوں کے باوجود مشرقی شعریات کے مسلمہ اصولوں کو، نووارد مغربی تصورات ادب کے ساتھ ہم آمیز کر کے اردو شعریات کو مرتب کرنے کی ایک نہایت وقیع اور بڑی حد تک کامیاب کوشش ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں یوں تو شبلی نعمانی، امداد امام اثر، مولوی عبدالحق اور مولوی عبدالرحمٰن دہلوی کے تنقیدی تعبیرات کی بالادستی رہی مگر ان کی تحریروں میں تنقیدی معیارات کی ترتیب نو کے ساتھ ان کے عملی انطباقات کی بعض کاوشیں سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی آل احمد سرور، محمد حسن عسکری، کلیم الدین احمد اور احتشام حسین کی وہ تحریریں بھی منظر عام پر آنا شروع ہو گئی تھیں جن میں مشرقی شعریات کے قدرے کم اور مغربی اصول وضوابط سے استفادے کے عمدہ نمونے متعارف ہونے لگے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کے بعد ان موخرالذکر نقادوں نے صرف دو تین دہائیوں میں اردو تنقید کو صحیح معنوں میں ادبی تنقید کے نئے تصور کی طرح نہ صرف یہ کہ استعمال کیا بلکہ اردو میں تنقید کو اعتبار اور کسی حد تک استناد کی سطح پر لا کھڑا کیا۔ ان سربرآوردہ نقادوں کے بعد جس نسل نے اردو تنقید کی حدوں میں وسعت پیدا کی ان میں بلاشبہ گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا، مغطر علی سید، وارث علوی اور فضیل جعفری کی ہمہ جہت تنقیدی کاوشوں کو اہمیت حاصل ہے۔ مگر یہ فہرست اس وقت تک مکمل اور معتبر نہیں

قرار دی جاسکتی جب تک اس میں وہاب اشرفی، شمیم حنفی اور حامدی کاشمیری کی تنقیدی کتب اور مضامین کی قدر و قیمت کو نہ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ بات اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' نے اپنے بعض نقائص کے باوجود ادبی استناد سازی میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا بالکل اسی طرح بعض مرکزی مقامات اور ادبی اداروں سے وابستہ نقادوں کو تنقیدی استناد کا حوالہ عموماً بنایا جاتا رہا اور قدرے دور افتادہ مقامات سے وابستہ نقادوں کی بہت اہم کوششوں کو بھی تنقیدی استناد سازی کا حصہ دار برائے نام ہی تصور کیا گیا۔ وہاب اشرفی کی ناقدانہ حیثیت کو بھی اسی خانے میں رکھنا چاہئے کہ ہنوز ان کی تنقید کے بارے میں ان کے کارناموں کی شایان شان کوئی اہم کام سامنے نہیں آیا۔

وہاب اشرفی نے بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں ایک محقق کی حیثیت سے متعدد قدیم متون پر تحقیقی جلدیں بھی مرتب کیں۔ بہت اہم اور قابل توجہ تنقیدی مضامین بھی لکھے اور عالمی ادب کی تاریخ بھی مرتب کرنے کی طرف توجہ کی۔ مگر محقق اور تاریخ نویس کی حیثیت کو عموماً کچھ ایسا نمایاں کیا گیا کہ ان کی اصلی حیثیت جو ایک اعلیٰ درجے کی نقاد کی تھی، وہ پس منظر میں چلی گئی۔

وہاب اشرفی نے قدیم ادبی تنقید کی تاریخ بھی مرتب کی ہے اور مابعد جدید تنقیدی تصورات پر ایک مکمل اور مبسوط کتاب بھی لکھی ہے۔ لیکن جو مضامین ان کی ناقدانہ اہمیت کا تعین کرنے میں ہمیشہ معاون ثابت ہوتے رہیں گے وہ اردو کے قدیم اور جدید ادبی سرمائے سے متعلق ان کے قابل توجہ مضامین ہیں جو ان کے چند مجموعہ ہائے مضامین میں شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین اردو کے ممتاز ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور وقفے وقفے سے ان مضامین نے ادبی حلقوں کو چونکایا بھی ہے اور وہاب اشرفی کی اہمیت کا احساس بھی دلایا ہے —— وہاب اشرفی کو شروع سے ہی علم بلاغت سے دلچسپی رہی ہے اور اس حوالے سے وہ محدود انداز میں مشرقی علوم شعر سے بھی آشنا رہے ہیں۔ مگر ان کے استفادے کا اصل میدان مغربی تنقید کے اصول و نظریات پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ مغربی اصول و معیار سے ان کی دلچسپی اس وقت بہت معنی خیز اور توجہ طلب بن جاتی ہے جب وہ ان اصولوں کو اردو کے سیاق و سباق میں بعض نئی شکلیں دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ادب پر ان کا کامیاب اطلاق کر کے انہیں تجزیے اور محاکمے کے عمل سے گزارتے ہیں۔ اپنے تنقیدی جائزوں میں انہیں اس بات کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی کہ وہ قدیم مغربی تنقید کی مبادیات کا اعادہ کرتے رہیں۔ مگر ان کی کم و بیش ہر تنقیدی تحریر، تنقید کی مغربی

بنیادوں سے گہرے شغف کا اظہار کرتی ہے۔اس کے ساتھ ہی فکشن کا معاملہ ہو، ڈرامے کی بات ہو یا شاعری کی پرکھ سے اصول وضوابط کا مسئلہ، انہوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کی مغربی تنقید کے رائج تصورات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ بھی کیا ہے اور ان تصورات کو اپنی تنقید میں بہت کارآمد طریقے سے استعمال بھی کرتے ہیں۔نئے مغربی تصورات سے ان کی والہانہ رغبت کا یہ عالم ہے کہ بسا اوقات ان کی فراہم کردہ معلومات تنقیدی فیشن میں رہنے کا بھی احساس دلاتی ہیں۔میتھو آرنلڈ سے لے کر ریے ویلے اور پھر آئی اے رچرڈز، ایف آر لیوس اور ٹی ایس ایلیٹ تک کے تنقیدی تصورات اور پرانی مغربی تنقید پر ان نقادوں کے ناقدانہ اضافے خصوصیت سے وہاب اشرفی کی دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ظاہر ہے کہ اس پس منظر سے گہری دلچسپی کے بغیر کوئی نقاد ہیئتی تنقید، نئی امریکی تنقید اور ہمارے ماضی قریب میں سب سے زیادہ مستعمل نئے مغربی تصورات کو کارآمد طریقے پر استعمال نہیں کرسکتا۔چنانچہ وہاب اشرفی بھی یہی طریقہ کار استعمال کرتے ہیں۔مگر ان کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ ابہام کے مسئلے پر گفتگو کریں، شاعری میں شخصیت کے گریز کے مسئلے پر اظہار خیال کریں، تناظر کی بات کریں یا قول محال کی، لفظ کے جدلیاتی استعمال کی گفتگو کریں، شاعری کی تین آوازوں کو زیر بحث لائیں یا شعری زبان کے جذباتی اور حوالہ جاتی معنی کو وسیلۂ نقد بنائیں، ہر جگہ اور ہر موقع پر وہ اپنے علمی سرچشمے کو یاد رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ضروری حوالے کے بغیر اپنے بیان کردہ ہر اصول کو ایجاد بندہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔یہ ان کی ایسی ناقدانہ دیانت داری ہے جس کا ہمیشہ اعتراف کیا جانا چاہئے۔ورنہ اردو میں جدید تنقید کے متعدد نمائندے کچھ اس طرح ان تصورات کو ذاتی ملکیت کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ اس بات کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا کہ دوسرے کے خیالات کہاں ختم ہوتے ہیں اور تنقید نگار کے اپنے اصول یا اطباقات کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔اس موقع پر بے محل نہ ہوگا کہ ایک ادبی ستم ظریف کے اس تبصرہ کا ذکر کردیا جائے جو اس نے ایک سربرآوردہ اردو نقاد کے بارے میں یہ سن کر کہ کیا ہی اچھا ہو کہ اس کے تنقیدی مضامین کو انگریزی میں ترجمہ کردیا جائے؟ اس ستم ظریف نے یہ تبصرہ کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا کہ ہاں، اس ترجمے سے انگریزی زبان کا تو کوئی بھلا نہ ہو گا مگر ہمارا نقاد پوری طرح سے بے نقاب ہو کر رہ جائے گا، اس لئے کہ لوگوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس سے کہیں زیادہ بہتر اور باسلیقہ انداز میں بیسویں صدی کے انگریزی نقادوں نے یہ باتیں پہلے سے اپنی کتابوں میں لکھ رکھی ہیں۔

وہاب اشرفی نے تنقیدی نظریات کے سلسلے میں مغرب سے جو استفادے کئے ہیں ان

میں اردو زبان کے مزاج اور اردو ادب کی روایت سے متعلق اپنی تربیت کو حتی الامکان ہم آمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔اس باعث ان کی تحریروں میں اصولوں کی حد تک تو مغرب سے واضح استفادہ اور خوشہ چینی کا انداز بھی ملتا ہے مگر جہاں کہیں انہوں نے مغربی اصولوں کا اطلاق اردو ادب پر کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اصولوں کی علمی دیارت پر ادب کی جمالیاتی قدریں زیادہ غالب اور نمایاں نظر آتی ہیں۔یہ بات اس لئے بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ کلیم الدین احمد جیسے نابغہ ادب وتنقید نے اپنی ساری تجزیاتی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت کے باوجود غزل اور نظم کی اصناف کے مابین خط امتیاز کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور محض اس تسامح کی وجہ سے کوئی بھی اردو کا نقادان کو اپنا ہدف بنانے میں تکلف نہیں کرتا۔یہ الگ بات ہے کہ اس نوع کے نقادوں میں کبھی کبھی وہاب اشرفی بھی شامل نظر آتے ہیں مگر ایسے موقعے پر وہاب اشرفی کلیم الدین شکنی سے کہیں زیادہ اردو کی مخصوص مشرقی اصناف کا دفاع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہاب اشرفی کے اہم مضامین کے انبار میں یوں تو نثری نظم، اسالیب نثر اور فکشن کے متعدد پہلوؤں پر ان کی تحریریں کچھ کم اہم نہیں معلوم ہوتیں، مگر ان کی بنیادی دلچسپی ادبی تنقید کی تاریخ اور جدید ادب پر تنقیدی اصولوں کے انطباق سے ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ''اردو تنقید کی نئی صورت''، ''نئی تنقید کے چند سال'' اور ''تحقیق وتنقید کا باہمی رشتہ'' جیسے موضوعات پر بڑے وقیع مضامین تحریر کئے ہیں۔ان مضامین کے علاوہ ''اردو ادب کدھر''، ''احتشام حسین کے تنقیدی رویے'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''شعر غیر شعر اور نثر'' پر بھی ان کے مضامین تنقیدی ضابطہ بندی اور اطلاقی تنقید کے بعض پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں —— ''اردو تنقید کی نئی صورت'' سے معنون وہاب اشرفی کا مضمون نہ صرف یہ کہ معاصر تنقید پر ان کی مکمل دسترس کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اردو تنقید کے اس منظر نامے کو بڑی بالغ نظری کے ساتھ نشان زد کرتا ہے جس میں ان کے متعدد بزرگ معاصرین اور ہم عمر نقادوں کی کاوشیں اپنی تعین قدر کے لیے وہاب اشرفی جیسے تجزیاتی ذہن کا تقاضہ کرتی ہیں۔زیر بحث مضمون میں آل احمد سرور، محمد حسن عسکری، وزیر آغا، خلیل الرحمٰن اعظمی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ محمد حسن، قمر رئیس اور سید محمد عقیل جیسے ترقی پسند نقادوں کی تحریروں پر بڑی حد تک قرار واقعی رائے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔چونکہ زیر بحث مضمون کے ابتدائی حصے میں محمد حسن کی ناقدانہ حیثیت کو بہت امتیاز کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس لیے ایک نگاہ اس بات پر ڈالنی مناسب ہوگی کہ ان کے بارے میں وہاب اشرفی کی رائے کس حد تک معروضیت کے ذیل میں آتی ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مضمون کی ابتدا

ساتھ ہی مضمون نگار محمد حسن کو ایک وسیع النظر اور غیر متعصب ترقی پسند نقاد ثابت کرنے کا ارادہ کئے بیٹھا ہے۔ اردو تنقید کی صورت حال کے جائزے میں لوکاچ کے بارے میں اصغر علی انجینئر کی تعبیرات اور ان تعبیرات کی بنیاد پر محمد حسن کی تنقیدی نگارشات میں لوکاچ سے مماثل رویے کی تلاش وجستجو دراصل پہلے سے طے شدہ معروضات کی توثیق کا انداز لئے ہوئے ہے۔ اصغر علی انجینئر کے الفاظ میں ان معروضات کے تعین کے بعد کہ ''لوکاچ یہ بات زور دے کر کہتا ہے کہ مارکس اور اینگلس نے بالزاک اور شیکسپیئر میں اپنے جمالیاتی اصولوں کی تعبیر دیکھی، شیلر اور رولا میں نہیں'' یا یہ کہ ''مارکس نے بالزاک اور ہاف مان کی قنوطیت پر مبنی کہانیوں کو ادب میں شمار کیا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ وہاب اشرفی ان خیالات کی بازگشت محمد حسن کی تحریروں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر بار بار توصیفی کلمات کے استعمال کے باوجود ان کی تحریروں کو اپنی توصیف کا گواہ نہیں بنا پاتے، وہ کبھی لکھتے ہیں کہ ''جناب محمد حسن ادبی جدت طرازیوں کو اپنے اشتراکی نقطہ نظر کی زنجیر پہنانے کے درپے نہیں'' یا یہ کہ ''وہ کھلے ذہن سے نئے ادبی میلانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں'' یا یہ کہ ''پروفیسر محمد حسن زیادہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں'' —— تاہم اس آرا کی موجودگی میں جب قاری محمد حسن کے ادعائی اور قطعی انداز نقد اور ادبی جمالیات کو سماجی افادیت کی نذر کر دینے کے بے لچک رویے کا سامنا کرتا ہے تو وہاب اشرفی جیسے بلند پایہ ادبی و تنقیدی پارکھ کی ترجمانی بھی کارآمد ہوتی نہیں معلوم ہوتی۔ اس سلسلے کی پوری بحث وہاب صاحب ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں کہ ''نئی ترقی پسندی اس لحاظ سے اپنی روش میں کٹرپن سے اپنا رشتہ توڑ رہی ہے ورنہ محمد حسن، اختر الایمان کے ساتھ خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیق حنفی، حبیب الرحمٰن اور مداحِ صلی کی نظم گوئی میں اچھی شاعری کے امکانات تلاش نہ کرتے'' ترقی پسندی کی اس نئی روش کی نشاندہی کے لئے جس ڈاکٹر محمد حسن کے بدلے ہوئے رویے کا حوالہ دیا گیا ہے وہی محمد حسن خلیل الرحمٰن اعظمی اور عادل منصوری کی مذہبیت اور قرۃ العین حیدر کے نوسٹلجیا کو اردو ادب کے لئے سم قاتل قرار دیتے رہے ہیں۔ کیا یہی کٹرپن سے اجتناب اور مذہب یا تہذیب کی قدروں سے شدید نفرت سے اپنے آپ کو بلند کرنے کی کوشش ہے، اور کیا یہ انداز نقد ادب کو نہایت غیر ادبی معیاروں سے دیکھنے اور پرکھنے کے مترادف نہیں —— اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ تنقیدی رائے زنی میں ذاتی مراسم سے بلند ہو کر معروضی نقطہ نظر اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی۔ تاہم تنقیدی رائے زنی میں اس نوع کی افراط و تفریط تو ہو ہی سکتی ہے، اہم بات یہ ہے کہ تنقیدی مقدمہ ٹھوس اصولوں کی بنیاد پر قائم کیا جائے اور استدلال کا طریق کار علمی اور منطقی ہونا چاہئے۔ وہاب

اشرفی نے اپنے زمانے کے تقریباً پورے منظرنامے کو زیر بحث مضمون میں سامنے رکھا ہے اور ان کے بیش تر نتائج نہ صرف قابل قبول معلوم ہوتے ہیں بلکہ ان کے نتائج کی منطقیت خود اپنا ثبوت آپ بن جاتی ہے۔ اپنے اس طویل مضمون میں وہاب اشرفی نے معاصر ادب، ادباء اور تنقید کے بیش تر مسائل پر اظہار خیال کی صورت نکالی ہے۔ انہوں نے آل احمد سرور کے بعض تنقیدی مغالطوں کو داخلی تضاد کا شکار بتادیا ہے اور اس مفروضے کے سلسلے میں ان کی تنقیدی آرا کو بنیاد بنا کر تنقیدی نتائج نکالے ہیں۔

آل احمد سرور کے تنقیدی رویوں کے نشیب و فراز کا ذکر کرتے ہوئے زیر بحث مضمون میں اس پس منظر کا ذکر کیا گیا ہے جو پس منظر ترقی پسندی سے سرور صاحب کی ابتدائی وابستگی اور پھر اس کے بعد جدیدیت کے زمانے میں، ادب کی جمالیاتی قدروں پر ان کے اصرار سے متعین ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سرور صاحب کے ایک ایسے مضمون کو زیر بحث لایا گیا ہے جو جدیدیت کی تعریف اور اس کی حدود متعین کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں سرور صاحب کی ان تعبیرات کو خاص طور سے وہاب اشرفی نے موضوع گفتگو بنایا ہے جن تعبیرات سے سرور صاحب کی جدیدیت اور جدیدیت کے پس منظر کے طور پر وجودیت کی تفہیم پر گفتگو کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۔

> ''سرور صاحب ایک طرف جدیدیت کا رشتہ وجودیت سے جوڑتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ 'اس میں انسانی عظمت کے ترانے بھی ہیں، اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے اور اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے۔''

آل احمد سرور اپنے عام مزاج کے مطابق کسی بھی اصطلاح کی تعریف میں بعض متضاد عناصر کی طرف نشاندہی کرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے۔ چنانچہ جدیدیت کا تناظر متعین کرتے ہوئے بھی وہ وجودی طرزِ فکر سے قدرے مختلف خطوط پر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وجودی مفکرین کے نزدیک وجود کیوں کر جوہر سے مقدم ہے، اور کس طرح انسانی ذات، سماجی اصول والقدار کا واحد پیمانہ بن کر رہ جاتی ہے اور کس واسطے وجودی رویوں کے بطن سے مہملیت اور لایعنیت کے تصورات کا استخراج ممکن ہے؟ سرور صاحب کے محولہ بالا تصور جدیدیت میں ان بنیادی باتوں سے اختلاف ملتا ہے، اسی باعث وہاب اشرفی اتمام حجت کے طور پر بعض وجودی مفکرین کے حوالے سے سرور صاحب کی رائے کے مغالطے کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ اسی اندازِ فکر

پر اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں

''دراصل جدیدیت کا تعلق اگر کسی حد تک بھی وجودیت سے ہے تو پھر اس تحریک کے تحت ادب کبھی انسان کی عظمت کا ترانہ نہیں بن سکتا۔ پھر فرد اور سماج کا رشتہ اتنا داخلی ہوگا کہ سماجی معنویت کا سوال خاصا پھیکا نظر آئے گا ــــ شاید سرور صاحب جدیدیت کی نئی تشکیل کرنا چاہتے ہیں ۔ اگر ایسا ہے تو اسے ہائیڈ گر، یا سپرس اور کرکے گار کی وجودیت سے الگ کرنا پڑے گا اور جدیدیت ان فلسفیوں سے الگ راہ اپنائے گی تو پھر عصریت میں مبدل ہو جائے گی ، جدیدیت نہیں رہے گی۔''

وہاب اشرفی نے سرور صاحب کی تنقید کے لئے خلیل الرحمٰن اعظمی سے توازن کی اصطلاح مستعار لی ہے اور بتایا ہے کہ سرور صاحب کی تنقید کے لئے سب سے بہتر رائے یہی ہے ۔واضح رہے کہ کلیم الدین احمد نے ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں آل احمد سرور کی تنقید کا سب سے بڑا نقص توازن کو ہی بتایا تھا۔ مگر وہاب اشرفی کا خیال ہے کہ کلیم صاحب نے اپنی بعد کی تحریروں میں سرور صاحب کے بارے میں اپنی رائے نرم کر لی تھی ۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کلیم صاحب اپنی تنقید کی بازیافت کرتے ہوئے یا پھر اپنی تنقیدی کتاب کے نئے ایڈیشن میں صرف یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کی تنقید نے سرور صاحب کو راہ راست پر آنے پر مجبور کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کلیم الدین احمد کے اپنے ذاتی تصورات کا حصار ہے جو ان کو اس سے باہر جا کر سوچنے کا موقع ہی نہیں فراہم کرتا ــــ سرور صاحب اور محمد حسن عسکری دونوں کے یہاں جو ذہنی اور فکری ارتقا ملتا ہے، اس ارتقا کے ساتھ ساتھ توازن کی تلاش بھی خاصی معنویت رکھتی ہے ۔ اتفاق سے یہ دونوں نہایت ممتاز اور سر برآوردہ نقاد کلیم الدین احمد کی آنکھوں میں ہر دور میں کھٹکتے رہے ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ مغرب کے تنقیدی افکار پر سوائے کلیم صاحب کے کسی اور کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی ۔ تو بھلا ان کو یہ بات کیسے گوارہ ہو کہ سرور صاحب اور عسکری صاحب مغربی افکار و نظریات سے بیش از بیش استفادہ کرنے کے باوجود کبھی بھی کلیم الدین احمد کی طرح اردو کے تہذیبی اور مقامی سرچشموں سے صرف نظر کرنے کا ارتکاب کر کے ان کو بے نقاب کرتے رہیں۔

وہاب اشرفی نے اپنے زمانے کی تنقیدی سرگرمیوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کو بھی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ مگر ان کا خیال ہے کہ وہ مغربی تناظر جو سرور صاحب کے یہاں جگہ جگہ نظر

آتا ہے وہ اعظمی کے یہاں مفقود ہے۔ وہاب صاحب اعظمی کو تنقیدی نظریات کے شارح کے طور پر دیکھتے ہیں، نظریہ ساز کے طور پر نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی رائے دیتے ہوئے ان کو یہ بات واضح کرنی پڑے گی کہ اردو میں کتنے نقاد ایسے ہیں جن کو نظریہ ساز کہا جا سکے؟ مغرب کے کچے پکے تصورات کو اپنے ادب کے مزاج سے ہم آہنگ کئے بغیر ان کی جگالی کرنے والے کہاں سے نظریہ ساز کہلانے کے مستحق ہیں؟ پھر بھی وہاب صاحب خلیل الرحمٰن اعظمی کی ان کاوشوں کی داد بڑی فراخ دلی سے دیتے ہیں جو جدید غزل اور نئی نظم کے سفر سے متعلق ہیں۔ شاید اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ اردو تنقید میں جن لوگوں نے نظری مباحث کی طرف زیادہ توجہ صرف کی ان کی نگاہ اکثر تنقید کے اطلاقی پہلوؤں سے ہٹی رہی اور اصناف کی تنقید میں انہوں نے بالعموم خلیل صاحب کی طرح اعلیٰ ادبی ذوق، روایت کے شعور اور شاعری کی عمدہ ترین تحسین کا ثبوت نہیں فراہم کیا۔

اپنے زیر بحث مضمون کے ساتھ وہاب اشرفی نے اردو تنقید کی صورت حال اور شعر، غیر شعر اور نثر سے متعلق اپنے تبصراتی مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید نگاری پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان مضامین میں ان کا انداز عموماً نیاز مندانہ تو نہیں مگر مویدانہ ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کا جو بھی مبلغ علم رہا ہے اس مبلغ علم کو وہاب اشرفی رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاروقی کے مغربی سرچشموں کی پوری نشاندہی کی اہلیت رکھنے کے باوجود وہ عموماً ایسا نہیں کرتے۔ اس لئے جیسے ہی راقم الحروف کی نگاہ سے ان کے یہ جملے گزرے، تو ان کو غنیمت جان کر من و عن نقل کر دینے کو جی چاہا۔

> ''بلاشبہ فاروقی صاحب نے شعر و ادب کے بعض بنیادی مسائل امریکہ کی نیو کریٹی سزم کے تناظر میں بغیر حوالے کے اٹھائے ہیں۔ ان کی کتابیں 'لفظ و معنی' اور 'شعر، غیر شعر اور نثر' اس لحاظ سے اہم تھیں اور ہیں کہ ان میں امریکی تنقید کی خوشہ چینی سے بعض تازہ ادبی مباحث کھڑے ہوئے ہیں۔ متن کو تختۂ مشق بنانے کا عمل گو کہ پرانا ہی ہے۔ یہ کام اس طریقہ کار کے اساسی پہلوؤں سے گفتگو کئے بغیر کلیم صاحب اپنے انداز میں کر چکے تھے۔'' الخ

واضح رہے کہ اس اقتباس میں متن کو تختۂ مشق بنانے کے الفاظ بجائے توصیف کے تضحیک کے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ تاہم اس غیر محتاط رویے کے باوجود اگر فاروقی کی انفرادیت

کو ان کے مخصوص سیاق و سباق میں اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے جس طرح اس اقتباس میں اور زیر بحث مضمون کے دوسرے حصّوں میں کی گئی ہے تو وہ بلاشبہ مصنّف کی علمی دیانت داری اور معروضیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ نثر اور شاعری میں کیا فرق ہے، علامت کسے کہتے ہیں اور ابہام کے کیا معنی ہیں؟ ان سوالات کے حوالے سے وہاب اشرفی نے فاروقی کے خیالات اور قضایا کا جائزہ لیا ہے اور بسا اوقات غیر مشروط داد دینے کا انداز اختیار کیا ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ فاروقی نے اپنی ایسی تنقیدی بساط بچھائی کہ ایک طرح سے ترقی پسندوں کے معاشی، عمرانی اور تاریخی تناظر کی بحث کو ادب میں غیر ضروری اور لایعنی ٹھہرایا۔ یہ انقلابی اقدام اپنی جگہ بہت مبارک سہی، اور ادبی رویوں کے ارتقاء میں ایسے انقلاب کا آنا ضروری سہی مگر گذشتہ دس پندرہ برسوں میں یہی شمس الرحمٰن فاروقی، جدیدیت سے مختلف اور اس کے آگے کے کسی بھی انحراف کے انجماد کی حد تک منکر ہو کر تاریخی تغیر و تبدل کی منطق کے ہی قائل نظر نہیں آتے۔ شمس الرحمٰن فاروقی چونکہ ان ممتاز نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے مغربی تنقید کے اصول و ضوابط کے ساتھ، ان کے اطلاقی اسالیب کو بھی مغرب سے سیکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان اصولوں کو اردو کے سیاق و سباق میں نئے سرے سے مرتب کرنے کی کوشش کی جائے جب وہاب اشرفی ان کی تنقیدی انفرادیت کی داد دیتے ہیں تو محض ان کے خیالات سے اپنی تائید کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ان کو فاروقی کی تنقید کا مغربی ڈھانچہ زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اس باعث ''شعر، غیر شعر اور نثر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

> ''نثر اور شعر اور غیر شعر کے بارے میں فاروقی کے جو نظریات ہیں یا کم از کم جو نظریات اس قیمتی مضمون میں پیش ہوئے ہیں ان سے مجھے کلّی اتفاق ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میری فکر کا محور بھی اسی دائرے میں رہا ہے''۔

اہم بات یہ ہے کہ اس تائیدی لب و لہجہ کے باوجود جہاں کہیں وہ فاروقی کی تنقید کے تضادات یا اصول اور ان کے انطباق میں تفریق کو محسوس کرتے ہیں اس کی نشاندہی میں بھی کوئی تکلف نہیں کرتے۔ اپنے ایک مضمون میں فاروقی کی علامت پسندی، ابہام شناسی اور شاعری اور غیر شاعری کے مابہ الامتیاز عناصر کی عمدہ نشاندہی کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ افسانے کے بارے میں فاروقی کے تعصبات، بعض کتابوں کے تبصروں میں جانب داری، فراق گورکھپوری کے بارے میں ان کے متضاد بیانات اور نظیر اکبر آبادی پر ان کے جانب دارانہ مضمون جس میں ان کی

افراط وتفریط اور موضوعی انداز تنقید کو بھی ہدف بنانے سے باز نہیں آتے اور ان الفاظ کے استعمال میں بھی کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے کہ

''نظری مباحث کے برخلاف جب ان کی بوطیقا تخلیق کے تجزیے کی کھرل پر آتی ہے تو عجیب سی مضحک صورت پیدا ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ ان لوگوں کو ضرور ہوگا جنہوں نے اس نوع کے مضامین پڑھ رکھے ہیں۔''

وہاب اشرفی نے اپنے بزرگ نقادوں میں کلیم الدین احمد اور محمد حسن عسکری پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ سرور صاحب کی تنقیدی زبان پر کلیم الدین احمد کے اعتراض کو تسلیم نہیں کرتے اور پلٹ کر کلیم صاحب کی زبان پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ مگر وہاب صاحب کا اعتراض بعض الفاظ کی تکرار کی نشاندہی سے آگے نہیں بڑھتا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حالی کے بعد اگر کسی ایک شخص کو تنقید کی منطقی زبان کو رائج کرنے والا بتایا جا سکتا ہے تو وہ کلیم الدین احمد کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ کلیم صاحب نے اپنے استاد ایف آر لیوس اور ان کے معاصرین سے کیا سیکھا اور لیوس کے رسالے ''اسکروٹنی'' کے انداز نقد کو کیوں کر اپنایا، اس لمبی بحث کو بھی وہاب صاحب نے چھیڑا ہے اور کلیم صاحب کے تنقیدی مزاج کی نشان دہی کی ہے۔ کلیم الدین احمد کے برخلاف وہ محمد حسن عسکری کی تنقید کی تعریف میں بجا طور پر رطب اللسان ہیں مگر عسکری کے بارے میں ساری بحث کو انہوں نے مشرق کی بازیافت کی اصطلاح میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اصطلاح عسکری نے یا کسی اور نقاد نے عسکری کے بارے میں پہلے کبھی استعمال نہ کی۔ البتہ ناچیز راقم الحروف نے محمد حسن عسکری کے مضامین کے انتخاب اور بعد کے زمانے کے مضامین میں ایک مخصوص رویے کے پیش نظر اس کے بارے میں اپنی مرتب کردہ کتاب کا نام ''مشرق کی بازیافت'' رکھ، ان کی فکر کو ایک مخصوص سیاق وسباق میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاب اشرفی جس رویے کو عسکری کی کل کائنات سمجھ کر اس مخصوص اصطلاح میں اس کا ذکر کرتے ہیں وہ رویہ عسکری کے مختلف رویوں کا مخصوص زمانی تناظر ہے جو عسکری کی مغرب پسندی سے لے کر مشرقیت تک کے سفر کی نوعیت کو سامنے لاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محمد حسن عسکری اپنے غیر معمولی روایتی رچاؤ اور حد درجہ مغرب سے استفادے کے باوجود اپنی تہذیبی اور ثقافتی جڑوں کو کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ مزید برآں ان کی حیرت انگیز غیر معمولی اسلوب محمد حسین آزاد کی طرح اپنے آپ میں ان کی ایک اہم شناخت ہے جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں

۔ جہاں تک عقیدے سے ادب کے رشتے اور عسکری صاحب کے شوشے چھوڑنے کی بات ہے تو ان باتوں کو عسکری کے ادبی سفر کے محض پڑاؤ کے طور پر دیکھنا چاہئے۔ سب سے اہم بات وہ ہے جو وہاب اشرفی نے عسکری پر اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہہ دی ہے کہ وہ اوّل و آخر ادب کی خود مختاری کے قائل تھے، اور یہی ان کا ایسا امتیاز ہے جس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہاب اشرفی لکھتے ہیں کہ ۔

> ''دیر سے سہی ان کا موقف ادب کے بارے میں یہ مرتب ہوا کہ اگر ادب تفہیم حیات کا منبع ہے تو پھر اسے عقائد سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ مذہب ادبی فروغ میں مانع نہیں۔ مشرق کی اپنی ادبی روایت کی تلاش اس بنیاد پر بھی ممکن ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے تصوّر میں وہ شعر ادب کی اوٹونومی کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے''

محمد حسن عسکری کے بارے میں کلیم الدین احمد نے ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں جس نوع کی غلط فہمیوں کو رواج دینے کی کوشش کی تھی اس کے برخلاف وہاب اشرفی نے عسکری کی تنقیدی فکر کو ایک مخصوص تناظر میں پیش کر کے بنیادی نکات کو گرفت میں لینے کا رویّہ اختیار کیا ہے۔ اس طرح یہ بات مبارک معلوم ہوتی ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقیدی زبان کا کفارہ اسی سرزمین سے کسی بالغ نظر نقاد نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس بات کے لئے وہاب اشرفی کو ایک ذمہ دار نقاد ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

نئی تنقید کے منظرنامے پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہاب اشرفی نے شمیم حنفی، قمر رئیس اور دوسرے ممتاز نقادوں کے ساتھ سید محمد عقیل کی غزل اور علامت کے متعلق تحریروں کا اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ رائے دی ہے کہ سید محمد عقیل کی فکر میں وسعت نظر آتی ہے۔ راقم الحروف کو اس رائے سے یکسر اختلاف ہے۔ اس لئے کہ عقیل صاحب کے یہاں تو محمد حسن وغیرہ سے بھی زیادہ ادعائیت اور قطعیت ملتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نئی اصطلاحات یا نئے مباحث کے لئے ایک نوع کا تجسس ضرور رکھتے ہیں مگر جب وہ ان مباحث کے اخلاقی پہلوؤں کی طرف آتے ہیں تو اپنے ادبی اور فکری تعصبات کو کسی بھی طرح چھپا نہیں پاتے —— وزیر آغا کے ذکر میں جہاں ان کی کاوشوں سے بحث کی گئی ہے وہ خاصی تجزیاتی ہے اور وزیر آغا کے کام سے انصاف کرتی ہے۔ تاہم یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وزیر آغا کی کتاب ''تخلیقی عمل'' کو وہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ایسے لوگوں کے لئے جن کی نگاہ سے آرتھر کوئسلر کی کتاب Creative

process گزر چکی ہے،اس کے لئے سوائے اس کے کتاب سے استفادے کے وزیر آغا کی کتاب میں کوئی خاص انکشافی بات نہیں ملتی ،ویسے یہ وزیر آغا کا عجز تو نہیں مگر بنیادی سر چشموں پر اگر نظر نہ رکھی جائے تو علمی اور فکری تناظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ وزیر آغا نے ''تخلیقی عمل'' میں اپنی طرف سے کسی احعا سے کام نہیں لیا ہے اور ضروری پس منظر کے طور پر کوئسلر اور یونگ سے تصورات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یونگ کا ذکر آ گیا ہے تو اس سلسلے میں علامت، آرکی ٹائپ اور اساطیر کے سیاق وسباق میں وزیر آغا کی تنقید کا اساطیری انداز بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی بن جاتا ہے۔وہاب اشرفی نے وزیر آغا کی تنقید کی شناخت کرتے ہوئے ان کے اس مخصوص نقطۂ نظر پر بھی عمدہ بحث کی ہے۔ مگر پتہ نہیں کیوں دبستان سرگودھا کے لکھنے والوں کے لئے وہاب صاحب تمسخر کا انداز اختیار کرتے ہیں۔حالانکہ وزیر آغا کو اگر اس دبستان کا مرکزی نقطہ ارتکاز سمجھا جائے تو عمرانیاتی نقطۂ نظر کو اس کے مختلف راویوں کے ساتھ پیش کرنے میں وزیر آغا کی اہمیت تسلیم شدہ سہی ،مگر انہیں اس ضمن میں اولیت حاصل نہیں۔اس سے قبل میراجی نے ''اس نظم میں''،جن نظموں کے تجزیے کئے ہیں اس میں بالعموم ان کا انداز ہ عمرانیاتی ہی ہے۔ بعد کے لوگوں میں جیلانی کامران اور سلیم احمد نے اس سلسلے کو یقیناً آگے بڑھایا ہے۔نظیر صدیقی یا انور سدید اپنی سہل پسندی کے باعث اس زاویۂ نظر کو کوئی فکری بنیاد فراہم نہیں کر سکے۔ میراجی کی تنقید کے بارے میں وہاب اشرفی کی یہ رائے بجا ہے کہ ان کے یہاں تحلیل نفسی نظر نہیں آتی ۔ دراصل اس ضمن میں فرائڈ کے تصورات کو ایڈلر اور یونگ کے تصورات سے خلط ملط کر دینے کے سبب بعض لوگوں نے تحلیل نفسی اور اجتماعی لاشعور میں تفریق کرنے کی طرف توجہ صرف نہیں کی ۔مگر یہ ایک الگ بحث ہے جس کی تفصیل میں نہ وہاب صاحب گئے ہیں اور نہ یہاں اس بات کا محل ہے۔

وہاب اشرفی نے ترقی پسند ادبی رویوں کے بعد کے بیش تر ادبی مباحث کو اپنے مضامین میں کسی نہ کسی صورت میں ضرور پیش کیا ہے۔انہوں نے نثری نظم پر بھی ایک اہم مضمون لکھا ہے اور اس مضموں میں نثر کے آہنگ کے مسئلے سے گفتگو کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ نثری نظم لکھنے والے شعرا اگر الفاظ کو جدلیات کی سطح پر استعمال نہیں کر پاتے تو ان کی نثری نظم ،نثر محض ہو کر رہ جاتی ہے ،نثری نظم کے دائرے میں نہیں آتی ۔ویسے نثر کے داخلی آہنگ کے بارے میں ''اوراق'' ؛''الفاظ'' اور بعض دوسرے رسائل کی ادبی بحث میں متعدد نقادوں نے اظہار خیال کیا تھا،مگر کسی کی تحریر میں نثر کے داخلی آہنگ یا زبان کی جدلیاتی منطق پر رک کر تجزیاتی گفتگو نہیں ملتی ۔کم وبیش یہی انداز وہاب اشرفی نے بھی اختیار کیا ہے۔انہوں نے نثری نظم کا وصف خاص ابہام اور اجمال

کو صرور بتایا ہے مگر نموے کے طور پر محمد حسن کی ایک ایسی نثری نظم پیش کی ہے جو نہ نظم ہے اور نہ اچھی نثر ——— وہاب اشرفی نے تنقید اور شاعری کے علاوہ فکشن پر بھی بعض قابل ذکر مضامین لکھے ہیں۔ افسانے کا منصب، پریم چند، جوگندر پال، غیاث احمد گدی اور منٹو کی افسانہ نگاری کے بارے میں ان کے مضامین میں بیانیہ کے مسائل، علامت اور تجرید کی بحث اور شاعری اور فکشن کی مٹتی ہوئی حد بندیوں پر اچھی بحث ملتی ہے۔ مگر منٹو کے افسانے ''پھندنے''، ''اردو افسانہ کل اور آج'' اور ''نیا افسانہ اور اس کے نقاد'' جیسے مضامین میں مصنف کو جدید دور کے افسانوں کے امتیازی مسائل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس نوع کے مباحث میں وہاب اشرفی کی تنقید میں ادب کی دیر پا اقدار کے بجائے وقتی اور ہنگامی ادبی رویوں کی عام تائید ملتی ہے، جس سے جدیدیت کے سیلاب میں ان کے بے دست پا ہونے کے علاوہ کسی اور بات کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ افتخار جالب کی نئی تشکیلات میں اور جدیدیت کے زیر اثر فکشن کی بنیادی قدر اور بیانیہ کی منطق سے جس طرح انحراف کی راہیں نکالی گئیں اس کا حشر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں ،اس لئے اس پس منظر میں صرف وہ لوگ معتبر ٹھہرے جنھوں نے ادبی فیشن کے طور پر ان رویوں کی وقتی تائید تو ضرور کی مگر جب یہ رویے حد سے آگے بڑھ گئے تو ان پر تنقید کرنے سے بھی باز نہیں آئے۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ نے اپنا غیر معمولی امتیاز قائم کیا۔ انہوں نے راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کی علامتی اور اساطیری تعبیرات کو نقطۂ عروج تک پہنچانے اور نئے فکشن کی تنقید میں قابل قبول رجحانات کی تائید کرنے کے کچھ عرصے کے بعد جب یہ محسوس کیا کہ پوری نسل کے ناعاقبت اندیش افسانہ نگاروں نے افسانے کے بنیادی منصب اور بیانیہ کی منطق کو ہی پامال کرنا شروع کر دیا ہے تو پھر لحہ فکریہ کے عنوان سے ان کی فیشن زدگی کو واشگاف انداز میں بے نقاب بھی کیا اور اردو میں صحیح معنوں میں افسانے کی باز یافت کی داغ بیل ڈالی۔ مگر وہاب اشرفی ان مباحث کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے باوجود گوپی چند نارنگ کے فکشن سے متعلق بہت اہم مضامین کا نہ صرف یہ کہ ذکر نہیں بلکہ افسانے کے نقادوں پر اعتراض کرتے ہوئے نارنگ کے بعض رویوں کو بھی ہدف بنانے میں تکلف نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''کئی سال پہلے جب نیا افسانہ جنم ہی لے رہا تھا تو پروفیسر نارنگ نے بڑی فراخدلی سے اس کا مزاج متعین کرتے ہوئے اسے علامتی اور تجریدی افسانہ تا کر اسی راستے پر بغیر سوچے سمجھے چل پڑنے کی گویا تلقین کر دی''۔ وہاب صاحب یہ بات تو غلط نہیں کہتے کہ علامت الگ چیز ہے اور تجرید الگ، مگر اں کی اس بات میں زور نہیں پیدا ہو پاتا کہ ''جدید افسانے کو تجریدی کہنا سراسر مہمل تنقید ہے۔'' جب کہ

حقیقت یہ ہے کہ علامتی اسلوب نے جدید افسانے میں بعض پہلوؤں کا اضافہ کیا تھا۔ ہاں تجریدی افسانوں کی وجہ سے نیا افسانہ اہمال کی حدوں کو چھونے لگا۔ کیا ''پھندنے'' میں محض علامت ہے تجریدی طریق کار نہیں، تلقارمس صرف علامتی افسانہ ہے، بلراج مین را نے کثرت سے تجرید کا استعمال نہیں کیا اور کیا رشید امجد اور قمر احسن کے یہاں واقعات، بیانیہ، کردار اور پلاٹ کو منہا کر کے تجریدی نثر لکھنے کی کوشش نہیں کی گئی؟ ان سوالات کا جواب تو بہرحال وہاب اشرفی کو ہی دینا ہوگا۔

وہاب اشرفی نے ''شعر اقبال کے علامتی پہلو'' کے عنوان سے ایک اہم اور قابل قدر مضمون لکھا تھا، مگر اس مضمون میں شروع سے اخیر تک علامت، علامت نگاری کا رجحان اور فرانسیسی علامت پسند شاعر اور ادیب تو بہت نمایاں ہیں مگر جو چیز نمایاں نہیں ہے وہ اقبال اور ان کی علامتی شاعری ہے، اور علامت نگاری کے فرانسیسی رجحان کا جہاں تک سوال ہے تو بودلیر، پاؤنڈ، یا ورلین یا ملارمے جیسی علامت پسندی تو اردو کے کسی بھی شاعر کے یہاں نہیں ملتی ۔ راشد اور میراجی تک کی پوری پوری نظمیں علامت نہیں بن پائیں بلکہ ہمارے یہاں علامتوں کا متفرق استعمال ہی ملتا ہے اور اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اور نہ اس سے اردو کے علامت پسند شاعروں کی اہمیت کم ہوتی ہے۔

وہاب اشرفی نے ابھی ماضی قریب میں مابعد جدید رویوں اور مابعد ساختیاتی شعریات پر بعض اہم مضامین لکھے ہیں اور ''مابعد جدیدیت ممکنات و مضمرات'' کے نام سے قابل قدر تصنیف شائع کی ہے۔ ان تحریروں میں اپنے زمانے کے ادبی رویوں سے ان کی نہ صرف وابستگی ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے وہ ایک بیدار مغز اور متجسس نوعیت کے نقاد ہیں۔ ایک ایسا نقاد جو ہر زمانے میں اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھنے کا قائل ہے اور ادب میں سامنے آنے والے نئے رجحانات کی چھان پھٹک کو اپنی بنیادی ضرورت تصور کرتے ہیں۔ مابعد جدیدیت سے متعلق مختلف تغیرات کو ایک جگہ جمع کرنے اور معاصر تنقید میں مابعد رویوں کی نشاندہی کرنے میں انہوں نے محض اولیت ہی حاصل نہیں کی ہے بلکہ رطب و یابس کی شناخت کا مرحلہ بھی طے کیا ہے۔ عالمی ادب کی تاریخ، ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو اس مضمون کے دائرہ کار میں نہیں آتا، مگر ان کی جو علمی دانش ورانہ اور ادبی قدر و قیمت سب سے زیادہ دیر پا رہنے والی ہے وہ ان کی ناقدانہ حیثیت ہے اور وہ بلاشبہ معاصر نقادوں میں اپنی انفرادیت اور امتیازات کو عرصے تک منواتے رہیں گے۔

علیم اللہ حالی

نقد شعر اور پروفیسر وہاب اشرفی

ادبی تنقید کا اعلیٰ ترین منصب یہ ہے کہ وہ شعروادب کیلئے بوطیقا وضع کرے۔ تجزیہ، تشریح، مطالعہ، متن کی تفہیم، محاسن اظہار و بیان کی نشاندہی اور دیگر متون سے موازنہ و مقابلہ درمیاں کی وہ منزلیں ہیں جن سے آگے بڑھ کر اور بہت آگے بڑھ کر بوطیقا کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے ادبی تنقید نگاری میں وہ مقام حاصل کرلیا ہے جہاں ان سے تنقید کی بوطیقا کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ اس بات سے صرف نظر نہیں کرنا چاہئے کہ ایک مدت کے بعد جب زندگی کا ڈھانچہ بدلتا ہے اور قدروں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں تو ان کا لازمی اثر شعروادب پر بھی ہوتا ہے۔ نئے سیاسی، سماجی، سائنسی، اقتصادی اور تہذیبی حالات زندگی کے لئے نئی قدریں پیدا کرتے ہیں اور ان سے شعروادب کے نئے عوامل ومحرکات سامنے آتے ہیں۔ اس لئے شعروادب کی بوطیقا اگرچہ متعدد بنیادی شرطوں پر اصرار کرتی ہے لیکن تغیرات سے ان شرائط (Conditions) میں بھی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے اور یوں شعروادب کے مطالعے کے لئے نئی بساط سامنے آجاتی ہے۔ پروفیسر اشرفی کے تنقیدی تصورات کا جائزہ لیتے ہوئے جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ صدیوں میں بننے والی ادبی روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ وزندگی اور ادب میں رونما ہونے والے تغیرات سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ بہت سی تبدیلیوں کا استقبال بھی کرتے ہیں۔ ادب کی سطح پر دیکھا جائے تو بلاشبہ بہت سی تبدیلیاں جو نئے حالات کے طفیل پیدا ہوتی ہیں اور ہمارے کلچر اور ادب کے بنیادی اجزا بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لیکن کچھ تحریکات اور تجربے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی زبان وادب میں Smuggled ہو کر آتے ہیں اور بہت تھوڑی مدت کے لئے شعلۂ مستعجل کی طرح بساط ادب پر روشن ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان میں ہمارے معاشرے کے اجزائے لاینفک بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے یہ جلد ہی اپنی موت مرجاتے ہیں۔ دیکھنا یہ بھی ہوگا کہ کیا پروفیسر اشرفی لحاتی

ادبی تموج اور قابلِ اعتبار نئے نقوش کی Scruting میں کیا رویہ اپناتے ہیں۔ پروفیسر اشرفی نے واضح طور پر یہ بات کہی ہے کہ ۔

''میری نگاہ میں ادبی روایات ہمیشہ محترم رہی ہیں، چاہے ان کا تعلق کسی بھی دبستان سے ہو۔ لیکن افکار و آراء کے ارتقاء میں ادب کی نئی روش ہی کا رول سب سے زیادہ اہم ہے۔ تغیر و تبدّل سے گھبرانے والے حقیقتاً ادبی رویّوں کو جامد و ساکت باور کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ زمانی تبدیلیاں غور و فکر کی نئی راہیں ہموار کرتی ہیں۔''

(آگہی کا منظر نامہ، اشاعت ۱۹۹۲ء، صفحہ۔۹)

اپنے اس نقطۂ نظر کا اعادہ کرتے ہوئے وہ پھر یہ کہتے ہیں ۔

''دراصل میں ادب کو ایک تسلط اور ارتقائی صورت میں دیکھنے کا علمبردار رہا ہوں۔ اس لئے میری نگاہ میں پچھلی تمام تر نگارشات کی اہمیت مسلم رہی ہے اگر وہ قرار واقعی ادبی لحاظ سے وقعت رکھتی ہیں۔'' (آگہی کا منظر نامہ، اشاعت ۱۹۹۲ء، صفحہ۔۱۱)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاب اشرفی شعر و ادب کو زمانی تغیرات کی روشنی میں دیکھنے کے قائل ہیں اور یہ ایک ایسا نقطۂ نظر ہے جس سے ادب کا قاری اپنے دور کے اثاثۂ ادب سے نئی روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ میں اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ ہر عہد کی تفہیم بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں مختلف ہوتی ہے۔ ہمارا شعری و ادبی سرمایہ ماضی میں جس معنویت کا حامل تھا آج نئی تفہیم کا متقاضی ہے۔ آج سراج، ولی، میر، غالب، ذوق، ناسخ اور دوسرے تمام شعراء کے کلام کے از سر نو مطالعے کی ضرورت ہے۔ نئے تنقیدی زاویے ماقبل کے ان مشاہیر شعراء میں نئی معنویت کے متعدد نقوش واضح کر سکتے ہیں۔ تخلیقی سرمائے کا ایک حصہ تو زمانی قید کا شکار ہوتا ہے لیکن اصیل فنکاروں کے تخلیقی سرمائے کا ایک بڑا حصہ ہر زمانے میں نئے مفہوم کے چراغ روشن کرتا رہتا ہے۔ یہ روشنی ہمیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ہم زندگی کی متغیر شرطوں سے متشکل ہونے والی نئی شعری جمالیات سے واقف ہو سکیں۔ وہاب اشرفی اس امر کی برابر تاکید کرتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ پروفیسر اشرفی نے یہ بتایا ہے کہ ۔

''نقاد پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ واضح کرے کہ اس کے پاس پرکھ کے معیار کیا کچھ ہیں؟ تنقیدی کسوٹی کیا ہے؟ استدلال کن بنیادوں پر قائم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے امور جن سے کسی فن پارے کی سمت میں اترنے کا راستہ ہموار ہوتا ہے ورنہ رائے محض تو کوئی بھی قائم کر سکتا ہے۔ اس میں تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کی کیا ضرورت ہے؟ گویا سب

سے پہلے نقاد کو خود اپنی تنقید کی بوطیقا سے واقف ہونا چاہئے۔"

(حرف حرف آشنا، اشاعت ۱۹۹۶ء، صفحہ ۔۸۔۷)

اسی تحریر میں چند سطروں کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ "بوطیقا ایک نہیں متعدد ہوسکتی ہے لیکن کسی ایک نقاد کے لئے ایک ہی بوطیقا ہوگی۔ وہ بیک وقت کئی اسکولوں میں نہیں بٹ سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی تنقید معلّق ہو جائے گی۔" یہ ایک ایسا تصوّر ہے جس پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں بوطیقا ادب کی تفہیم کے لئے بنیادی جمالیات کی ترتیب کرتی ہے یہ ایسی قدریں ہوتی ہیں جن سے زمانہ دراز تک تخلیقی رویّے کی شناخت ہوسکتی ہے اور اسی صنف ادب کے ان اجزائے ترکیبی کی تفہیم ہوتی ہے جو مشکل سے ہی بدلتے ہیں۔ کسی تخلیقی فن پارے کی تفہیم بلاشبہ الگ الگ دبستانوں اور اسکولوں کے اتباع سے مختلف انداز میں کی جاسکتی ہے۔ اسکول یا کسی ادبی تحریک سے پیدا شدہ نظریات تفہیم کے طریق کار تو بن سکتے ہیں اور ان میں باہمی اختلافات کی گنجائش بھی ہوسکتی ہے لیکن بنیادی ادبی جمالیات جن سے بوطیقا کی تشکیل ہوتی ہے رنگ ثبات کی حامل ہوتی ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے اردو کی شعری ونثری تخلیقات کا مطالعہ زمانی حدود سے آزاد ہو کر کیا ہے۔ ان کی دسترس میں دور قدیم، دور متوسط اور عہد حاضر کی تمام ادبی تخلیقات موجود ہیں۔ اس لئے ان کا مطالعہ قدیم وجدید دونوں کو سمیٹ کر ایک مجموعی تاثر پیش کرتا ہے۔ وہ تخلیقی سطح پر "زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک" کے قائل ہیں اور ادب کی سطح پر مجموعی یافت اور اس کی اہمیت کا شعور بخشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے شعری ونثری دونوں صنفوں کے تخلیقی سرمائے کو کھنگالا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں سے اردو نثر کا تخلیقی سرمایہ زیادہ فیض یاب ہو پایا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہاب اشرفی ایک زمانے تک افسانہ نگاری کرتے رہے ہیں اور عین اس وقت جب اپنے عہد میں افسانہ نگاروں کی صف میں ان کی معتبر جگہ بن رہی تھی، وہ اسے تیاگ کر تنقید وتحقیق کی طرف راغب ہو گئے۔ ظاہر ہے اس پرانی محبت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ ان کی تنقیدی تحریروں کا بڑا حصّہ نثری ادب کا احاطہ کرتا ہے۔ بہ ایں ہمہ انہوں نے شاعری کے حوالے سے جو مطالعات پیش کئے ہیں اور اس ضمن میں جو نظریات اور تصوّرات وضع کئے ہیں، ان کی قدر ومنزلت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر وہاب اشرفی کے تنقیدی مقالات میں کہیں شعر اقبال علامتی پہلو پر نکتہ رسی ملتی ہے تو کہیں جمیل مظہری کے تخلیقی رویّے کا تفصیلی مطالعہ حاصل ہوتا ہے، کہیں نثری نظم کے جواز

پر عالمانہ بحث ہے تو کہیں کنکریٹ شاعری کا تفصیلی تعارف، کہیں یہ بحث ملتی ہے کہ شعری تخلیق کی تشریح قاری کو کس حد تک متن شعر سے قریب رکھ سکتی ہے، کہیں غالب کی تفہیم کے لئے خود غالب کی شعری بوطیقا کو سمجھنے پر زور دیا گیا ہے، مومن کی غزل گوئی کے نئے پہلوؤں سے آشنائی بخشی گئی ہے اور کہیں نئی شاعری کی علامتی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ شاعری کے حوالے سے کچھ پرانے اور نئے شعراء کے فکر و اسلوب پر سیر حاصل بحثیں بھی ملتی ہیں۔ ان مقالات کے مطالعے سے مجموعی طور پر جو تاثرات حاصل ہوتے ہیں ان کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر اشرفی بنیادی شعری محرکات کی تفہیم پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ شاعری کے ضمن میں ہونے والے روایتی تنقید کا بہت بڑا حصہ محض ''غلط یہ الفاظ، یہ بندش بری، یہ مضمون سست'' جیسے خارجی اور ثانوی اہمیت کے نکات سے بحث کرتا رہا ہے۔

غزل میں تغزل، نظم میں موضوع اور تسلسل مضمون اور آگے چل کر غزل و شعر کے وقتی IMPRESION سے ہٹ کر وہاب اشرفی بیشتر شاعر کے اس تخلیقی رویّے سے سروکار رکھتے ہیں جس کی بنیاد پر کوئی فنکار عام مروجہ الفاظ کو نئی ترتیب و ترکیب بخش دیتا ہے اور کلام میں اپنے احساسات کو اس طرح دیرفہم معنوی تہہ داریوں کے ساتھ پیش کرتا ہے جس سے فن کار کی گفتنی اور ناگفتنی کے درمیان ایک نیم گفتنی کی فضا بنتی ہے۔ اسی فضا کی پہچان تخلیق کار کی منفرد شخصیت سے متعارف کراتی ہے اور اس کے تخلیقی امتیاز کی نشاندہی کرتی ہے۔ جمیل مظہری کے کلام پر گفتگو کرتے ہوئے وہ یہ لکھتے ہیں کہ۔

> ''مجھے اس کی فکر نہیں کہ جمیل مظہری کی غزلوں میں تغزل کی کیا کیفیت ہے؟ یا اس کی نظموں میں کون سا نظام زندگی منظوم ہوا ہے، مجھے اس کی تلاش نہیں کہ ان کے خیالات کتنے ارفع واعلیٰ ہیں۔ مجھے اس کی بھی غرض نہیں کہ ہماری مستحسن قدریں کس حد تک ان کی شاعری کا حصہ بنیں ہیں یا زندگی کے کیسے کیسے اقدار و معیار ان کی فکر رسا کا ساتھ دے سکے ہیں۔ مجھے ان کے تخلیقی رویّہ سے بحث ہے، الفاظ کے برتاؤ سے غرض ہے، ان کے استعارے کے نظام اور پیکر تراشی کے طریقۂ کار کی تفہیم مقصود ہے اور ان امور کے پس منظر میں ان کے ماتہب اور حساس دل کی کیفیت کو سمجھنا ہے۔''
>
> (''معنی کی تلاش'' اشاعت ۱۹۹۵ء صفحہ ۸۵)

شاعری کی روح میں اترنے والا یہی حوصلہ اور رویّہ ہے جو پروفیسر وہاب اشرفی پر نقد سخن کے چند اہم مضمرات کے دروازے وا کر دیتا ہے۔ مثلاً وہ شعر کی تشریح و تفسیر (جسے وہ نثری معنی

کہتے ہیں) کی مارسائیوں کا ذکر کرتے ہیں اور بڑے تیقن کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ نثر تک پہنچتے پہنچتے شعر اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس علمی اور تنقیدی نکتے کی وضاحت کلام اقبال کے شارحین بالخصوص کلیم الدین احمد کی تنقید کی روشنی میں کی ہے۔ اس ضمن میں اس دلچسپ حقیقت کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ اقبال نے ''اسرار خودی'' میں حافظ کے کلام پر سخت تنقید کرتے ہوئے ان کے ذکر بادہ و جام اور رندی و مستی کی کیفیات کو قوم کی فعالیت اور تحرک کے لئے مہلک قرار دیا ہے۔ لیکن جب عذر گناہ کے طور پر انہوں نے نثر میں اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کی تو بات کچھ سے کچھ ہو گئی اور قارئین کو یہ احساس ہونے لگا کہ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔ نثر کی وضاحت شاعری کی اشارت کی قاتل بن جاتی ہے۔ غرض یہ کہ شاعری جب نثر میں منتقل ہونا چاہتی ہے تو اپنی اصل سے خاصی دور ہو جاتی ہے۔ یہ معنوی مغالطہ شرح اور ترجمہ کے باب میں عام ہے۔ ان مسائل پر پہلے بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ ذرا آگے تک غور کیجئے تو بسا اوقات ترجمہ سے معنوی تحریف کا اندیشہ بھی لاحق ہو جاتا ہے اور یوں صحف سماوی کے ترجموں کے جواز کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔

اقبال کی رومانیت کے موضوع پر اگر چہ پروفیسر وہاب اشرفی نے مختصر گفتگو کی ہے مگر اس اختصار میں بھی انہوں نے چند بنیادی نکات پیش کر کے اپنے فکر و نظر کا ثبوت دیا ہے۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ رومانیت ایک کثیر المفہوم لفظ ہے اور مختلف اہل نظر نے اس اصطلاح کو مختلف ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی متضاد معنی میں استعمال کیا ہے اس کے باوجود انہوں نے اقبال کے حوالے سے رومانیت کی جو بحث کی ہے اس میں رومانیت کے عام متعارف مفہوم کو ہی سامنے رکھا ہے۔ ہاں انہوں نے اقبال کے اس اختصاص کا بطور خاص ذکر کیا ہے کہ اس نے مظاہر فطرت کے خارجی مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان کے اندروں میں اتر کر ایک نیا جہان معنی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تصور میں انہیں انور سدید کی تحریر سے تعاون ملا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اقبال کی رومانیت پسندی کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے جہاں وحوش و طیور سے نئی علائم سازی کا کام لیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ امور رومانیت کے عام مروجہ مفہوم بلکہ جزوی مفہوم کے اشارہ نما ہیں لیکن وہاب اشرفی نے ان کے ذریعہ کلام اقبال کی چند خاص جہتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اقبال کی رومانیت کے ابتدائی نقوش ان کی اس ذہنی مراجعت میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے، جہاں وہ مذہب سے تصوّف کی طرف سفر کرتے ہیں اور جس کی متعدد مثالیں ان کی آخری دور کی غزلوں میں مل جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ احتجاج کے ان موضوعات سے بھی انکا سراغ لگایا جا سکتا ہے

جہاں انقلاب خوں آشام ہونے کی بجائے فکر انگیز اور بصر افروز دکھائی دیتا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی نئی شعری ہیئتوں اور تخلیقی تجربات کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ وہ درآمدات پر روک لگانے کے قائل نہیں۔ نثری نظم کی صنفی حیثیت منوانے کے لئے وہ مغرب کے حوالہ جات کا خزانہ کھول دیتے ہیں۔ کنکریٹ شاعری کے تعارف میں وہ مغربی علمائے ادب کے فرمودات کی مارش کر دیتے ہیں، ادب میں ہر نئے تجربے کو لبیک کہتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ عصر حاضر کے اہل قلم اور تخلیق کاروں کے بیچ مقبول ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ آدمی NON-CONTROVERTIAL ہو کر رہے۔ وہ ادب کی آتی جاتی لہروں پر نظر رکھتے ہیں اور کسی تحریک، کسی تصور و رجحان اور تجربات کے اتھل پتھل پر اپنی منفی رائے دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ میرا طریقۂ فکر یہ ہے کہ ہر دور میں ہونے والے تجربات کے سلسلے میں حاصا حساس ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے تجربات محض شوق تجربہ کی ضمن میں آتے ہیں۔ اصل تخلیقی کاوشوں کی مخلصانہ کوششیں تو بلاشبہ قابل ستائش ہیں مگر جب بوالہوس حسن پرستی شعار کرنے لگے تو یقیناً تشویش کی بات ہے۔ ایسے میں حسن اور عشق دونوں کی حرمت خطرے میں پڑ جاتی ہے نثری نظم کا رواج مغرب میں چاہے عام ہو اور ایسی تخلیقات کی بنیاد پر خواہ کتنے ہی اہل قلم اپنے اپنے حلقوں میں چاہے جس قدر معتبر قرار دئے گئے ہوں، لیکن یہ شہرت اور مقبولیت ہمارے لئے سند نہیں بن سکتی۔ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس مزاج کی ساخت و پرداخت میں اس زباں کے استعمال کرنے والوں کی صدیوں میں بننے والی ثقافت و تہذیب کا ہاتھ ہوتا ہے۔ زبان کلچر کا اٹوٹ حصہ ہے۔ یہ فطرت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، جغرافیائی اور تہذیبی حالات سے الفاظ کی ایجاد ہوتی ہے، ان سے ہمارے صوتی مخرج کی نوعیت طے ہوتی ہے اس سے ہمارے شعور کی ایک خاص ترتیب و تہذیب ہوتی ہے اور خوب و زشت کا معیار متعین ہوتا ہے، آوازوں کی دلکشی اور کراہت کا ایک مخصوص نظام بنتا ہے اور اس کے ساتھ یہ طے ہوتا ہے کہ آوازوں کے کون سے یونٹ اور ان کی کس طرح کی ترتیبیں ہمارے لئے سمع نوازی کا باعث بن سکتی ہیں اور کون سی سمع خراشی کا۔ جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کی تبدیلیوں سے فطرت کے تمام مظاہر مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایک خطۂ ارض میں پھلنے والے پھل اور پھول دوسرے خطے میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ انسانوں اور جانوروں کی وضع قطع بدل جاتی ہے۔ اس لئے ہم سیدھے طور پر یہ کہہ کر اپنے دیار کے لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے کہ یہ بات دیار مغرب میں مقبول ہو چکی ہے۔ ہاں مطالعات کی کثرت سے ادبیات عالم سے واقفیت اور اضافہ علم و دانش ایک محامد سے

اور مرتبے کی بات ہے۔ اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن تخلیقی سطح پر اخذ و قبول کا مسئلہ دوسرا ہے۔ اردو کے سماعی و بصری نظام میں فطری طور پر جو تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ تو ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن کوئی بات خارج سے تھوپی نہیں جا سکتی ہے۔ تجربے ہوتے ہیں، ہوتے رہیں گے تمام تجربات تخلیق کے مقدس مقام تک نہیں پہنچتے کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ نثری نظم، آزاد غزل، غزل نما، ماہیا، ہائیکو، دوہا (بشمول وہ دوہے جو اصلی ہیئت کے Distortion کے بعد اردو کے شعری مزاج کے مطابق بنانے کے نمونے ہیں) ترائیلے، سانیٹ، ثلاثی اور دوسری بہت سی دیسی بدیسی ہیئتوں میں ہمارے ہنرمندوں نے تجربات کا ایک انبار لگا دیا تھا۔ نہ جانے کتنی مشقت، محنت، وقت اور قیمتی صلاحیتوں کے Cost پر تجربات کے اس خزانہ عامرہ میں سے کچھ ہی چیزیں ہیں جو ہماری اچھی شاعری کا درجہ حاصل کر سکی ہیں۔ تنقید کا کام صرف استقبال کرنا ہی نہیں ہے بلکہ لوگوں کو Futile efforts کے نقصانات سے باخبر کرنا بھی ہے۔ اردو میں نثری نظم یا دوسری ہیئتوں میں ہونے والے تجربات کے نتائج سے پروفیسر وہاب اشرفی بھی بے خبر نہیں ہیں۔ اس لئے اس کے جواز میں وہ پروفیسر محمد حسن کی ایک اوسط درجے کی نظم پیش کرنے پر ہی اکتفا کر گئے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ادبی نثر لفظوں کا خرام ہے اور شاعری ایک رقص ہے لیکن رقص کا بھی اپنا نظام ہوتا ہے۔ بے اصولے اور بے ہنگم طور پر پاؤں پٹخنے اور اچھل کود سے رقص کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ باتیں مجھ سے بہتر پروفیسر اشرفی سمجھتے ہیں۔ میں ان امور پر ان کی ان تحریروں کی روشنی میں گفتگو کر رہا ہوں، جن کا ذکر مقالے کے ابتدائی حصے میں کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کے مطالعے کی وسعت و کثرت کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ انہیں حقائق سے استنتاج کی بھی غیر معمولی صلاحیت عطا ہوئی ہے، ان کی نظر تخلیقی متن کے چار دانگ تک پہنچتی ہے۔ نکتہ رسی اور نکتہ آفرینی میں ان کی ذہنی توانائی قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔ نظریاتی تنقید کے باب میں ان کی تحریریں استناد کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ تخلیق کی سرحدوں سے گھوم آئے ہیں، اس لئے ہر تخلیقی کاوش کو محبت اور ہمدردی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

''تاریخ ادبیات عالم'' کی ترتیب و تدوین انہیں فرصت اور صحت دے تو وہ اصولی اور نظریاتی تنقید کے میدان میں مزید اہم کارنامے پیش کر سکتے ہیں۔ جو بڑے ہوتے ہیں انہیں سے بڑی توقعات بھی ہوتی ہیں۔

عبدالصمد

دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

۱۹۶۰ء سے پہلے کی بات ہے۔

میں اردو کا تیسرا قاعدہ ختم کر چکا تھا اور اردو اخبارات کسی طرح پڑھ لینے کے لائق بن گیا تھا۔ والدہ محترمہ کو مطالعہ کا ذوق تھا۔ وہ لائبریری سے کتابیں منگواتیں، ناول اور رسالے خریدتیں بھی۔ ان کے آس پاس پھیلی ہوئی کتابوں کو کبھی کبھار اٹھا کر دیکھ لیتا۔

انہیں دنوں باہر کھیلتے ہوئے ڈاکیہ نے ایک موٹی سی کتاب کا پیکٹ تھما دیا، جو والد محترم کے نام تھا، وہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ والدہ کے پاس لے گیا تو انہوں نے مطلوبہ روپے دے کر وی پی چھڑا لیا اور پیکٹ مجھے دے دیا۔ ماہنامہ ''صنم'' پٹنہ کا بہار نمبر تھا۔ مضامین، افسانوں اور شاعری وغیرہ سے بھرپور۔ میں اسے پا کر پھولے نہیں سمایا۔ اصل جو چیز میرے لئے باعث کشش تھی وہ تھی ادیبوں کی تصویریں۔ پروفیسر سید حسن کی تصویر تھی جو والدہ کے رشتے کے ماموں تھے اور اکثر گھر تشریف لاتے۔ کلیم عاجز کی تصویر تھی جو برابر تشریف لاتے۔ انہیں تصویروں میں ایک تصویر ایسی تھی جس پر بار بار نگاہیں پڑ رہی تھیں۔ پتہ نہیں اس تصویر میں کون سی کشش تھی ــــــ؟

خوبصورت اور تیکھے ناک نقشے، تصویر میں بھی چمکتی ہوئی آنکھیں، ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ، فلمی ہیرو کی طرح بڑے بڑے خوبصورت بال بار بار اس تصویر کو دیکھتا اور دل کی سادہ دیواروں پر لکھتا رہتا میں بھی ایسا ہی بنوں گا، میں بھی ایسا ہی بنوں گا۔

رسالے کو ہر وقت سینے سے لگائے رہتا۔ چھاپے خانے کی خاص خوشبو عجیب سرشاری کی کیفیت پیدا کر رہی تھی، اس پر سے ایک مخصوص تصویر سے جذباتی اور ذہنی لگاؤ کئی ہفتوں کی کاوش کے بعد سارے مشمولات پڑھ گیا۔ بار بار پڑھا۔ کچھ سمجھ میں آیا، کچھ سر کے اوپر سے نکل گیا، کچھ میں دلچسپی محسوس ہوئی، کچھ کو پڑھنے کے لئے اپنے آپ کو بہت مشکل سے آمادہ کرنا پڑا افسانوں کے باب سے ایک خاص دلچسپی محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ جو نازک سا ایک

رشتہ بنا وہ آج تک نہ صرف برقرار ہے بلکہ اس میں مضبوطی اور استحکام آیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ادب سے میری دلچسپی کی بنیاد ''صنم'' کے بہار نمبر نے ڈالی۔

''صنم'' میرے ہاں پابندی سے آتا رہا۔ بعد میں دوسرے ہاتھوں میں چلا گیا، پھر بند بھی ہو گیا جو بہار کی ادبی تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ان تصویروں میں جس ایک تصویر نے دل میں گھر کر لیا تھا، اس کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۱۹۷۱ء میں، میں نے بی اے کیا اور شعبۂ سیاسیات، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا میں داخلہ لیا۔ لکھنے لکھانے کی حد تک اردو سے دلچسپی تھی۔ میرے لئے یہ وہ زبان تھی جس میں والدین، رشتے کی بہنوں، بھائیوں اور دوستوں کو خط لکھتا اور ان کے جواب وصول کرتا۔ اردو کے اساتذہ کی نقل و حرکت کی نہ کوئی جانکاری تھی نہ دلچسپی۔

پہلے ہی دن کچھ دوستوں نے اصرار کیا کہ گیا میں واقع یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس (جواب وائس چانسلر کی رہائش گاہ میں تبدیل ہو چکا ہے) میں جلسہ میلا دالنبی ہے، اس میں شرکت کی جائے۔ میں نے سوچا بسم اللہ مسعود ہو رہی ہے۔ برکت سے فیض اٹھانے کی غرض سے وہاں چلا گیا۔ گیسٹ ہاؤس کے لان میں ایک خوبصورت محفل سجی تھی، ہلکی ہلکی روشنی تھی اور گلابی جاڑوں کی شروعات ..... مائک پر نظر پڑی تو زور سے چونکا۔ دس بارہ سال پہلے دیکھی ہوئی تصویر ..... وہی موہنی صورت، وہی اونچی پیشانی، آنکھوں میں وہی چمک، ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ، فلمی ہیرو کی طرح وہی بڑے بڑے خوبصورت بال

''ارے یہ تو .....''

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، میرے دوست نے جلدی سے میرا ہاتھ دبایا۔

''ہاں وہی ..... یہیں شعبہ اردو میں ہیں نا .....''

میں خاموش بیٹھا سیرت النبیؐ پر ان کے خیالات سنتا رہا بہت عمدہ اور شستہ زبان اور آج کے دور میں سیرت کی معنویت کے نت نئے پہلو ..... عام ڈگر سے بالکل ہٹ کر تقریر تھی۔ اس موضوع پر اب تک عالموں اور ملاؤں کی تقریریں سنتا رہا تھا لیکن کسی ماڈرن دانشور کی یہ پہلی تقریر تھی جس سے بصیرت اندر اندر تک اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

محفل کے خاتمے پر مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ اس وقت جو افراتفری پیدا ہوئی اس سے ثابت ہوا کہ یہ میلا دہی کی محفل تھی۔ جناب کلام حیدری آگے کی صف میں تشریف فرما تھے۔ وہ والد محترم کے دوستوں میں تھے اور بہار شریف میں ہمارے گھر ان کا برابر آنا جانا تھا۔ میں نے ان

کے پاس جا کر سلام عرض کیا، وہ چونک اٹھے۔

''تم یہاں ؟''

''جی ہاں یہیں داخلہ لیا ہے اور آج ہی ''

''بہت خوب کوئی مشکل ہو تو بلا تکلف کہنا اور ہاں ملنا ضرور ''

تب وہ موہنی صورت ان کے بغل میں تشریف فرما ہو چکی تھی، کلام حیدری صاحب نے فوراً تعارف کرایا۔

''وہاب اشرفی اور یہ عبدالصمد کئی افسانے چھپے ہیں ان کے ''

انہوں نے غور سے مجھے دیکھا، پھر آہستہ سے دریافت کیا۔

''بارہ رنگوں والا کمرہ، والے ؟''

خوشی سے اچھل پڑنے کی ماری تھی میری، بہت مشکل سے ضبط کیا کہ آداب محفل کے خلاف تھا، زبان کو بھی جنبش نہیں ہوئی، صرف سر ہلا دیا اثبات میں۔

ان کے چہرے پر بھی خوشی کے جذبات ابھرے اور اٹھتے ہوئے انہوں نے صرف یہی کہا۔

''ملتے رہئے گا ''

واقعہ یہ ہے کہ افسانے تو اس وقت تک میرے کئی چھپ چکے تھے لیکن ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ کے ایک خاص نمبر میں میرا افسانہ ''بارہ رنگوں والا کمرہ'' چھپا تھا، جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ پروفیسر احتشام حسین نے بھی اس کی تعریف کی تھی۔ میرے افسانوں کے پہلے مجموعے کا نام بھی یہی پڑا۔ مجھے اپنے بارے میں نہ اس وقت کوئی خوش فہمی تھی نہ الحمدللہ آج ہے۔ میں ایمانداری کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا ہوں اور لگا رہنا چاہتا ہوں۔ اور بس۔۔۔ لیکن اس چھوٹی سی دریافت نے میرے اندر کیا کچھ بھر دیا، اسے کچھ میں ہی جانتا ہوں اور مجھے آج بھی اس کی توانائی محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہی توانائی میرے ہاتھوں سے قلم چھٹنے نہیں پاتی۔

دوسری حیرت انگیز خوشی یہ ہوئی کہ ان کے بھتیجے وکیل اشرفی نے بھی میرے ساتھ داخلہ لیا تھا، انگریزی میں، اور وہ انہیں کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی خفت محسوس نہیں ہو رہی کہ وکیل سے ربط ضبط بڑھانے میں میری ایک غرض پوشیدہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان سے میرے گہرے رشتے کی پہلی اینٹ وکیل اشرفی ہی ہیں، جو اس وقت ماشاءاللہ ایم پی سنہا سائنس کالج، مظفرپور میں پرنسپل ہیں۔

لگ بھگ تیس برسوں کے تعلقات کا احاطہ کرنا، وہ بھی چند الفاظ میں، میرے جیسے آدمی کے لئے ممکن ہی نہیں، جو الفاظ کو ناچتے، گاتے، اچھلتے کودتے، چلتے پھرتے دیکھ کر ہمیشہ حسرت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اپنی کم مائیگی کا جسے دائمی افسوس ہے۔ اس طویل عرصے میں بے شمار رات اور دن ہیں، لمحوں کی بے شمار کڑیاں ہیں، واقعات کے انگنت جگنو ہیں اور ایسی ایسی باتیں ہیں جنہیں صفحہ قرطاس پر اتارنے کی کوشش کی جائے تو پتہ نہیں کتنے صفحات سیاہ ہو جائیں اور بیان ختم نہ ہو، ہاں ایمانداری شرط ہے۔

دراصل یادوں کی جھولی میں اس قدر جھلملاتے ہوئے جگنو ہیں کہ یہ طے کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ ان میں کس کا انتخاب کیا جائے۔ تیس برس کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا اور وہ بھی یوں کہ زیادہ عرصہ بہت قربت کا رہا ہو۔

یہ وہی زمانہ ہے جب کلام حیدری کے ہفتہ وار ''مورچہ'' میں محمود ہاشمی کے ساتھ ان کا مشہور ادبی مناظرہ منعقد ہو چکا تھا۔ ادبی افق پر وہ ایک درخشاں ستارے کی مانند چمک رہے تھے۔ ملک کی ممتاز و مشہور ادبی شخصیتیں کسی نہ کسی بہانے گیا آنے لگی تھیں۔ میربانی کے لئے کلام حیدری کا وسیع و عریض بنگلہ اور ان کی مہمان نوازی حاضر تھیں۔ ان لوگوں کے آنے کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد وہاب اشرفی سے ملنا اور اس سے باتیں کرنا بھی شامل ہوتا۔ منصبی اعتبار سے وہاب اشرفی تازہ تازہ یونیورسٹی میں آئے تھے جہاں لوگ برسوں نئے لوگوں کو پہچانتے بھی نہیں، لیکن وہ دو تین برسوں ہی میں نہ صرف یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں ممتاز ہو چکے تھے بلکہ شہر کے مقتدر لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ وہ اردو کے استاد تھے لیکن صرف شعبہ اردو کے چہار دیواریوں تک کبھی محدود نہیں رہے۔ ان کے ذہن کی کھڑکیاں ہمیشہ سے کھلی ہیں۔ ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی حلقوں میں ان کی رائیں وزن رکھنے لگی تھیں۔ لوگ اس کے یہاں حاضری دینے میں فخر محسوس کرتے۔ اس وقت انہوں نے میرے ساتھ دوستانہ سلوک کا آغاز کیا۔ غور فرمائیے کہ ایک طرف میں ان کے بھتیجے کا کلاس فیلو اور دوست، دوسری طرف چچا محترم کا دوستانہ ہاتھ مجھے ان دونوں سے ان کی حیثیتوں کے مطابق تعلقات رکھنا تھا۔ آج اتنے عرصہ کے بعد جائزہ لے رہا ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ شاید میں اپنی کوششوں میں کامیاب رہا۔ یونیورسیٹی سے واپسی اکثر ایک ہی بس پر ہوتی، میری قیام گاہ ان سے کافی آگے تھی، اپنے گھر کے پاس وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اتار لیتے۔

''کھانا کھا کر جایئے گا''

''لیکن ''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، کھانا آخر کھانا ہے، وہ کھانا رات میں کھا لیجئے گا ''

میرے لئے یہ ایک انتہائی اعزاز کی بات تھی۔ ایک ایسا فرد جو ادب اور یونیورسٹی دونوں میں نو وارد ہو، وہ وہاب اشرفی جیسی شخصیت کے یہاں مدعو ہو اور بار بار۔۔۔ اعلیٰ درجے کے کھانے کے ساتھ اس سے ادب کے معاملات پر انتہائی لمبی باتیں ہوتیں۔ باتیں کیا، میں صرف ان کی سنتا رہتا۔ یوں بھی میں ان معاملات میں کیا بولتا۔ نہ اس وقت کچھ بول سکتا تھا نہ آج بول سکتا ہوں لیکن ان کی عالمانہ باتوں سے مجھے جو کچھ حاصل ہوا، اس سے میں آج تک مستفید ہو رہا ہوں۔ ان کی توجہ خاص سے شہہ پا کر میں اپنی کہانیوں کو ان کے پاس لے کر بیٹھ جاتا۔ ایک ایک کہانی پر گھنٹوں بحث ہوتی۔ ان بحثوں کے نتیجے میں، میں نے اپنی بہت سی کہانیاں ضائع کر دیں اور بہت سی کہانیوں کو نئے سرے سے لکھا۔ ادبی معاملات میں پہلی روشنی اور رہنمائی مجھے انہیں سے ملی۔

وہاب اشرفی، یونیورسٹی سروس میں کافی تاخیر سے داخل ہوئے لیکن ترقی کے منازل انہوں نے برق رفتاری سے طے کئے اور صرف اپنی صلاحیت اور قابلیت کے بل پر۔ مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا میں پانچ چھ برس کام کرنے کے بعد وہ رانچی یونیورسٹی میں ریڈر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے تشریف لے گئے پھر دس برسوں کی تکمیل کے بعد پروفیسر منتخب ہوئے۔ درس و تدریس کی دنیا کی بلندیوں پر ان کا گویا یہ داخلہ تھا۔ نہ صرف قومی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ درجنوں یونیورسٹیوں میں وہ خطبات کے لئے مدعو کئے گئے اور بہت سی یونیورسٹیوں کی مجلس منتظمہ کے ممبر رہے۔ وہ اپنے شعبہ اور حلقے کی تدریسی دنیا کے برسوں سیاہ و سفید کے مالک رہے ان کے سامنے بڑے بڑوں کو سر تسلیم خم کرتے دیکھا گیا۔

۱۹۹۴ء کے اواخر کی پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب انہوں نے یونیورسٹی سروس کمیشن بہار کے چیرمین کی حیثیت سے پٹنہ آنا منظور کیا۔ یوں یہ ایک باوقار اور اعلیٰ عہدہ ہے لیکن یہیں سے ان کی چمکدار شخصیت تہہ در تہہ پردوں میں گم ہونی شروع ہو گئی۔ اصلی وہاب اشرفی ان رنگین پردوں میں گم ہوتا رہا اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ اور جب خبر ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

ان کی فطری شگفتگی معدوم ہو گئی اور مزاج میں ایک چڑچڑا پن سا آ گیا۔ بعض اوقات ان کی زباں سے ایسی باتیں نکل جاتیں جو ان کے مزاج سے بالکل منافی ہوتیں۔ دراصل پردوں میں گم ہوتے ہوئے یہ ایک زندہ انسان کی چیخ تھی جو اندر سے کسی قسم کے سمجھوتہ کرنے کا بالکل

رواداری نہیں تھا لیکن جو سمجھوتہ کرنے پر مجبور تھا۔ مصروفیتوں کی جکڑ بندیوں نے انہیں اس طرح گھیر لیا کہ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے۔ کسی باشعور اور زندہ انسان کا یہ سب سے بڑا کرب ہے۔

بالکل غیر دانستہ طور پر ان کے بعض فعل وسکنات سے ان کے کچھ قریبی دوستوں کو شکایت ہوگئی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اصلی وہاب اشرفی یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔ سارا قصور ان مہین جھلیوں کا ہے جو انہیں قبضے میں لے چکی ہیں اور جو آنکھوں کی تیز روشنی کو بھی تاریک کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لوگ سمجھتے کہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر وہ بہت خوش اور مطمئن ہیں، وسیع وعریض سرکاری بنگلے میں رہ کر بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں۔ کاروں کی جھرمٹ میں سفر کر کے وہ کسی دوسری ہی دنیا کے فرد بن چکے ہیں۔ تیس برسوں کی قربت میں جہاں تک میں انہیں جان پایا ہوں، ان میں کوئی بات صحیح نہیں۔ اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر وہ کبھی مطمئن اور خوش نہیں رہے بلکہ ایک طرح کی بے چینی اور اضطرابی کیفیت ان پر چھائی رہی۔ مطمئن اور خوش تو وہ دراصل اس وقت تھے جب وہ شعبہ اردو، مگدھ یونیورسٹی میں لکچرر تھے۔ ادب کی اونچی کرسی انہوں نے اپنی صلاحیت اور قابلیت سے حاصل کی تھی اور وہ اس کرسی پر بیٹھ کر حکومت فرماتے تھے۔ وسیع وعریض سرکاری بنگلے میں رہ کر وہ کبھی بڑے آدمی نہیں بنے۔ بڑے آدمی وہ اس وقت تھے جب دو یا تین کمروں کے مختصر سے کرایہ کے مکان میں مقیم تھے اور ان کا ایک ایک حرف پڑھنے کے لئے لوگ بیتاب رہا کرتے۔ وہ ریشمی ڈوریوں میں بندھ کر اس حقیقی بڑے آدمی کی پرچھائیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے جو ان سے روٹھ کر کہیں کھو گیا تھا۔

کاروں کی جھرمٹ میں سفر کر کے وہ کبھی کسی دوسری دنیا کی مخلوق نہیں بنے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قسم کے لوازمات ان ذمہ داریوں کا لازمی حصہ ہیں جو ان کا مقدر بن چکی ہیں۔ چمک دمک کی دنیا میں وہ پھنسے ضرور لیکن ان کی آنکھیں ہمیشہ کھلی رہیں اور اپنی سوچ وفکر پر ان کا اپنا قبضہ قائم رہا۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان پر کوئی دوسری شخصیت لد گئی ہے۔ اگیا تال کی طرح وہ ان کی گردن پر سوار ہوگئی ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس اگیا تال سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی وہ مسلسل کوشش بھی کرتے رہے۔

ایمانداری سے تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ دراصل ان کی اپنی ایک شخصیت کے اندر کئی شخصیتیں پیدا ہوگئی تھیں اور وہ سب کی سب انہیں کشاں کشاں مختلف سمتوں میں لے جا رہی تھیں۔ ان میں ایک شخصیت تو وہ بھی تھی جس نے اگیا بتال کو اپنے اوپر سوار ہوتے

دیکھ کر فوراً احتجاج نہیں کیا۔ ایک وہ بھی ہے جو انہیں سمجھوتہ کرنے پر مجبور کرتی رہی۔ ایک وہ بھی جو انہیں ان کے اصلی منصب سے چپکے چپکے دور رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔

سوال یہ نہیں کہ وہ کن اونچی کرسیوں پر بیٹھے اور کن رنگین ریشمی ڈوریوں کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مضبوط پکڑے رکھا، اہم بات یہ ہے کہ مایا جال سے نکلنے کی کوشش انہوں نے ہمیشہ کی۔ یہ اور بات ہے کہ جوں جوں وہ کوشش کرتے رہے، توں توں وہ اس میں پھنستے گئے۔ شاید یہی تگ و دو انہیں زندہ رکھے ہوئی ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی ہرگز کمی نہیں جنھوں نے اپنا سب کچھ تو بیچ ہی دیا، اپنا آپ بھی نہیں چھوڑا۔ ان کی اپنی پہچان دور بہت دور ہوتی گئی اور وہ ایک ایسے ویرانے میں نکل آئے جہاں کوئی ان کی آواز سننے والا بھی باقی نہیں رہا۔ ان کے اندر سے جو چیخ ابھرتی ہے وہ یا تو ان کے اندر اندر گھٹ کر ناسور بنتی ہے یا باہر نکل کر صدائے بازگشت ثابت ہوتی۔

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اگر وہاب اشرفی ان ریشمی ڈوریوں کو نہ پکڑتے تو ان کی بہت سی صلاحیتیں بھی منظر عام پر نہ آتیں، مثلاً ان کی انتظامی صلاحیتیں

اردو کے ایک استاد اور ایک خالص ادیب سے کبھی توقع نہیں کی جاتی کہ اس کے اندر کچھ ایسی صلاحتیں بھی ہوں گی جو ہمیشہ سے دوسروں کا مقدر ہیں، جنھیں دور سے دیکھ کر اور محسوس کر کے صرف رشک کیا جا سکتا ہے۔

وہاب اشرفی نے یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیرمین کی کرسی پر بیٹھ کر ایک تاریخ بنائی۔ انہوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے جو دوسروں کے لئے ناممکنات میں سے تھے۔ برسوں سے دبے ہوئے بیک لاگ کی انہوں نے گرد جھاڑی اور ناالصافیوں کے ایک بہت ہی لمبے سلسلے کی جڑ کاٹ کے یونیورسٹی اساتذہ میں اعتماد کی ایک نئی روح پھونکی۔ تیس چالیس برسوں سے التوا میں پڑے سیکڑوں پرسپل کی انہوں نے بحالی کی۔ ان بحالیوں کو طرح طرح کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ مخالفین نے ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک کے راستے کی دھول اڑائی۔ فتح انصاف کی ہوئی اور عدالت عالیہ نے ان کے سارے کیئے ہوئے کو جائز ٹھہرایا۔

آج کے سماج میں معمولی معمولی اسامیوں کے لئے جو کھینچا تانی، رشوت خوری، دھونس، دباؤ، دھمکیاں اور طرح طرح کی گھیرابندی ہے، ان چیزوں کے پیش نظر بڑے بڑے دل گردے والوں کا بھاگ نکلنا اور ہار مان لینا فطری بات ہے، لیکن تنقید و تحقیق کی دنیا میں پناہ ڈھونڈنے والے، ساری زندگی ادب کے لئے وقف کر دینے والے اردو کے اس پروفیسر نے ملک کی تعلیمی

تاریخ میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ یک وقت تقریباً ڈیڑھ ہزار لکچرروں کی بحالی ہوئی۔ دشمنوں کے سینے پر سانپ لوٹ گیا، اخباروں میں ان کے خلاف کردارکشی کی ایک باقاعدہ مہم چلائی گئی، گندگی کا ایک ایسا دریا بہایا گیا جس میں دوست اور دشمن دونوں نے جی بھر کے اپنے ہاتھ دھوئے۔ ان دوستوں نے بھی جو برابر ان سے مستفید ہوتے رہے اور ان دشمنوں نے بھی جن کے ہتھیار ان کے سامنے کند ہو چکے تھے۔ معاملہ حسب معمول ہائی کورٹ میں لے جایا گیا، برسوں سنوائی ہوتی رہی، اس دوراں لوگوں کو انہیں ذہنی ٹارچر کرنے کا خوب خوب موقع ہاتھ آیا۔ بلکہ کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔ وقت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ گزر جاتا ہے۔ چنانچہ گزر گیا اور بالآخر جیت سچ کی ہوئی، ہائی کورٹ نے نہ صرف ان کے فیصلوں پر تصدیق کی مہر لگادی بلکہ توصیفی الفاظ کے ساتھ اپنا فیصلہ سنایا، لیکن دشمنوں کو چین کہاں، سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا، وہاں بھی مہر تصدیق لگنے میں دیر نہیں لگی اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ ابھی اس ملک میں انصاف کی کرنیں چمک رہی ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جو شخص تقریباً ساڑھے چار برسوں تک کانٹوں کا تاج پہنے رہا ہو، جس کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے کو نہ صرف چیلنج کیا جاتا رہا ہو بلکہ اس کی دھجیاں اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی ہو، اس پر سے درجنوں بیماریوں کا چاروں طرف سے حملہ، اس شخص کی ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی۔؟

کمال ہے اس شخص کے حوصلے اور ہمّت کا کہ اس نے کسی محاذ پر شکست تسلیم نہیں کی۔ اس وقت بھی وہ جب بے تکلف دوستوں کی محفل میں بیٹھا تو اپنی فطری خوش دلی اور شوخیوں کو چھپا نہیں سکا اور اس کے قہقہے سب سے بلند رہے۔

خوش مزاجی
خوش دلی
لطیفہ گوئی
اپنے آپ پر ہنسنے کا آرٹ
اور دل کھول کر قہقہے لگانے کا فن کوئی وہاب اشرفی سے سیکھے۔

مجھے ان کے ساتھ کافی وقت گذارنے کا موقع ملا ہے، سفر حضر میں ان کا بہت ساتھ رہا ہے، انہیں ہر رنگ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف رہا ہے، ان کی بہت سی باتیں ناگوار گذری ہیں، بہت سی باتوں پر چپ رہا ہوں، اور بہت سے مسئلے پر برملا ان

کے سامنے اظہار بھی کیا ہے، لیکن کیا مجال جو کبھی انہوں نے کسی بات کا برا مانا ہو اور کیا مجال جو کبھی ان کے قہقہے رکے ہوں۔ اصل میں جو آدمی اپنے آپ پر ہنسنے کا عادی ہو، اسے کہاں ریر کریں گے آپ ؟

بے تکلف دوستوں کی محفل میں اپنی ان کمزوریوں کا ذکر کرنا، جنہیں لب پر لانا بھی لوگ معیوب سمجھتے ہوں، نہ صرف ذکر کرنا بلکہ ان پر خود ہنسنا اور دوسروں کو ہنسنے پر مجبور کرنا یہ کام صرف وہاب اشرفی ہی کر سکتے ہیں، دوسروں کے پاس یہ دل گردہ کہاں ؟

ان کے ساتھ کبھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کا ہر دوست ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارنا چاہتا ہے۔ ان کی صحبت سے جو توانائی اور رندگی ملتی ہے، وہ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتی۔

اپنے آپ پر دوسروں کو ہنسنے پر مجبور کرنے والے اس شخص کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو کبھی اپنا نشانہ نہیں بناتا، ان دوستوں کو بھی جن کے بارے میں اچھی طرح پتہ ہے کہ وہ ان کی باتوں کا برا نہیں مانیں گے۔ دوستوں کے معاملے میں وہ ایک خاص حد سے آگے نہیں جاتے، حد سے تجاور وہ صرف اپنے معاملے میں کرتے ہیں سفاکانہ حد تک

بیماریوں اور وہاب اشرفی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بیماریوں کا کچھ نہ کچھ سلسلہ بلکہ بعض مستقل سلسلہ ہمیشہ ان کے ساتھ لگا رہتا ہے، ڈاکٹروں سے رابطہ بنا رہتا ہے، علاج چلتے رہتے ہیں، دوائیں ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہیں اور ان کے ایک وقت کی مقدار خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اتنی ضرور ہوتی ہے کہ وہاب اشرفی جیسے منحنی شخص کے ناشتے کے لئے کافی ہو جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی غذا حیرت انگیز حد تک مختصر ہے۔ کھانے میں ان کے ساتھ شریک ہونا بعض اوقات کوفت کا باعث ہوتا ہے۔ ایک یا ڈیڑھ چپاتی، ایک آدھ چمچہ چاول، اسی کی مناسبت سے سالن مرحوم کلام حیدری کی غذا بھی بہت مختصر تھی لیکن وہ ایک ہی چپاتی کو لنچ یا ڈنر کے پورے اوقات میں یوں فنکارانہ اندار میں کھاتے کہ ساتھ کھانے والے کو خفت نہیں اٹھانی پڑتی وہاب اشرفی کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ایک وقت کے ناشتے کے مقدار کے برابر تو وہ دوائیاں کھاتے ہیں تو پھر بقیہ کھانے اور ناشتے کے بیلنس کو کیسے برقرار رکھیں ؟

دستر خوان البتہ ہمیشہ ان کا وسیع رہا، نہ صرف یہ کہ انواع اقسام کے کھانے بلکہ کھانے کے وقت اگر کوئی موجود رہا تو اس کی شرکت لازمی یہ صورت حال ابھی نہیں ہے۔ اس وقت بھی تھی اور آج سے کچھ زیادہ ہی تھی، جب وہ لکچرر تھے۔ اہم اور حساس عہدوں پر کام کرنے کے

سب وہ کافی حد تک سمٹ گئے ہیں اور وہ سماجی زندگی نہیں گذار سکتے جس کے وہ دلدادہ تھے۔ کچھ نا معلوم سی پابندیاں انہیں جکڑے رہتی ہیں لیکن جب بھی موقع ملتا ہے وہ ان پابندیوں کو توڑنے کی کوششیں ضرور کرتے ہیں آپ انہیں کسی موقع پر مدعو کیجئے فرصت ہوئی تو شرکت کرنے کی کوشش ضرور کریں گے۔ مصروف ہوئے تو معذرت کر لیں گے۔ کسی محفل میں بیٹھیں خود بخود مرکزی حیثیت کے حامل ہو جائیں گے۔ ان کے جیسی محبوبیت بہت کم لوگوں میں دیکھی۔ ان کے بڑے سے بڑے دشمن کو ان کے سامنے ریشہ خطمی ہوتے دیکھا۔ ایسی بات نہیں کہ وہ ایسے دشمنوں کی زد میں نہ آئے ہوں نشانے پر تو وہ ہمیشہ رہے، یہ بات دوسری ہے کہ دشمن انہیں زیادہ گزند نہیں پہنچا سکے۔ ذہنی ٹارچر کے باوجود مختصر سے ایک عرصے کو چھوڑ کر ہنسنے ہنسانے کا ان کا گراف بہت لمبا ہے اور یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ ان کی شخصیت کا ایک بہت ہی اہم حصہ ہے۔ دراصل منہ سائے ہوئے، چڑچڑاتے ہوئے اور ایسے او پر سنجیدگی کا بھاری لبادہ اوڑھے ہوئے وہاب اشرفی کسی کو منظور نہیں۔

ان میں ایک صلاحیت کا زبردست فقدان ہے۔ وہ دشمنی نہیں کر سکتے۔ مقابلہ وہ ضرور کرتے ہیں لیکن صرف اپنے بچاؤ کی حد تک۔ ان سے ان کے دشمنوں کو کبھی گزند نہیں پہنچتا۔ ان پر دشمنوں کی یلغار بہت ہوئی ہے لیکن وہ ٹڈی دل کی طرح پسپا بھی نہیں ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کوششوں سے زیادہ فضل الٰہی رہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ شخص بھلے ہی روایتی قسم کا مذہبی نہ ہو، اس کے طے شدہ ارکان کی پابندی نہ کرتا ہو، لیکن ہے یہ بہت ہی ایمان والا بندہ یہ خالق دو جہاں سے محبت کرتا ہے، ساتھ ہی اس کے بندوں سے بھی، اس کے بندوں کی بھلائی کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ کسی کے بارے میں کینہ اور بغض و عناد نہیں پالتا، کسی کے خلاف سازشیں نہیں کرتا، کسی کو بر سر بازار ذلیل کرنے کی ترکیبیں نہیں سوچتا، کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، کسی کا دل نہیں دکھاتا، جہاں تک بس چلے لوگوں کی بھلائی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے ایسے ایمان والے شخص پر فضل ربی کیوں نہ ہو ؟

اگر آپ ان کی چاہت کی فہرست میں شامل ہیں (واضح رہے کہ یہ فہرست ضرورت سے زیادہ ہی طویل ہے!) تو وہ ہر وقت کوشاں رہیں گے کہ کس طرح ان کے ذریعہ آپ کا کچھ بھلا ہو جائے دامے، درمے، سخنے جہاں آپ فٹ بیٹھ جائیں۔ آپ کسی خانے میں فٹ نہیں بیٹھے تو وہ سوچیں گے کہ آپ ان کے کسی قریبی دوست کے کسی خانے میں فٹ بیٹھ جائیں۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بالکل بھول جائیں گے کہ ہر شخص وہاب اشرفی نہیں ہوتا۔ ایک دوست سے

ناکامی ہوئی تو دوسری طرف رخ کریں گے، ادھر بھی نہیں تو پھر تیسری طرف ایسا بھی ہوا ہے کہ ہر طرف ناکامی کا بورڈ دکھائی دینے لگا تو خفیف ہو کر طے کرتے ہیں کہ آئندہ کسی کے پاس نہیں جائیں گے اور ضرورت مند صاحب سے صاف معذرت کر لیں گے۔ لیکن عادت بھلا اتنی آسانی سے چھوٹتی ہے۔

ان پر ایک پرانا الزام ہے کہ وہ اقربا پرور ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ان کے باایمان ہونے کی دلیل ہے۔ یہ تو خالق دو جہاں ہی کا حکم ہے کہ جب بھلائی کی نیت کرو تو سب سے پہلے اپنے عزیز و اقارب کی طرف نگاہ کرو کہ تم پر سب سے پہلا حق انہیں کا ہے۔ ان کے عزیز و اقارب پھیلے ہوئے ہیں اور جب بھی وہ نگاہ اٹھاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی ضرورت مند نظر آ ہی جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کی ضرورتیں ان کے سامنے بالکل کھلی ہوئی ہیں اس لئے وہ ان کی مدد کرنے پر مجبور ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ خدا نے انہیں چھوٹے بڑے منصب اس لئے عطا فرمائے کہ وہ اپنے پرایوں کا بھلا کر سکیں ورنہ

Bulk میں بھلائی کرنے کا موقع آیا تو اس کے دور دراز دیک رہنے والا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اسے نوازا نہ ہو۔ وہ اگر کسی کی مدد کرنے کی ٹھان لیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی، وہ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے اور کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ انہیں کبھی کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہوتا۔ انہیں اپنے آپ پر اس قدر اعتماد ہے کہ حق کی راہ میں قدم اٹھاتے ہوئے وہ کبھی لڑکھڑاتے نہیں۔ میں نے ان سے بڑے بڑوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے جس سے ہم کلام ہوتے ہوئے اچھے اچھے لڑکھڑا جاتے ہیں لیکن وہ نہایت ثابت قدمی سے اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔

ایمان کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ حق بات برملا کہی جائے۔ وہاب اشرفی میں ایمان کی یہ علامت موجود ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنی بات حق بات اس انداز میں کہنے کا فن جانتے ہیں کہ سننے والے کو اس کی تلخی محسوس نہیں ہوتی، بعد میں غور کرنے پر بھلے ہی اس کی چوٹ بری طرح محسوس ہو۔ کیا اپنے، کیا پرائے۔ وہ سب کی مدد کو فوراً تیار ہو جاتے ہیں، اگر کہیں فون کرنا ہو تو فون سے، بہ نفس نفیس جانا ہو تو چل کر وہ نہ اس کا صلہ چاہتے ہیں نہ کبھی ان کی زبان پر اس کا ذکر آتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ احسان ہو گا ایک پیسے کے برابر، بتایا جائے گا اسے سو روپے کے برابر۔ وہاب اشرفی کو تو یاد بھی نہیں کہ انہوں نے کتنے بے شمار لوگوں پر احسانات کئے، کتنوں کی زندگیاں بنائیں اور کتنے لاتعداد گھروں کے چولہے جلوا دئے۔ کبھی کبھی کوئی احسان

مندان کے سامنے اعتراف کرتا ہے تب انہیں یاد آتا ہے کہ اس شخص کی شکل کچھ پہچانی سی لگتی ہے۔

وہ روایتی اور عادی قسم کے مومن نہیں۔ لیکن وہ سب خصوصیات ان کی فطرت میں شامل ہیں جو ایک مرد مومن کی پہچان ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مانگے بغیر خدا نے انہیں وہ سب کچھ بخش دیا جو ایک کامیاب انسان کو بخشا جا سکتا ہے۔ خدا نے انہیں چار بیٹوں سے نوازا، سب کے سب اپنی زندگیوں میں بہت مگن اور خوش، لڑکی نہیں ہے جس کی وہ زبردست کمی محسوس کرتے ہیں۔ ایک بے سہارا لڑکی کو پال پوس کر بڑے اہتمام سے اس کی شادی کی اور اس کی خوشحالی کے لئے ہمیشہ دعاء گو اور کوشاں رہے۔

وہاب اشرفی کے بارے میں ان کے دوستوں اور غیر دوستوں میں اس طرح غلط فہمیاں پھیلی رہتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ وہ انہیں دور کرنے کی فکر بھی نہیں کرتے، انہیں ان باتوں کی زیادہ پرواہ بھی نہیں۔ زیادہ تر باتیں ان کی اپنی ذات سے متعلق ہوتی ہیں۔ جو اگر سچ بھی ہوں تو ان سے کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں۔ دراصل حسد و جلن ہر اس آدمی کا مقدر ہیں جو اپنی صلاحیتوں اور خدا کے فضل و کرم سے اپنے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں پر ہر بالشتئے، ہوس زدہ اور جعلی قسم کے آدمیوں کی کوتاہ بیں نگاہیں ہر وقت پڑتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے نگاہوں میں ایک ہی آدمی بار بار آ رہا ہو تو حسد کی آگ میں جلنا لازمی ٹھہرتا ہے۔ اس جہاں رنگ و بو میں بعض لوگ صرف دوسروں میں کیڑے نکالنے، کمزوریاں تلاش کرنے اور دوسروں کو بلا وجہ گالیاں دینے کے لئے پیدا ہی ہوئے ہیں۔ سور ہمیشہ گندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ پرانے زمانوں میں کچھ مخصوص قسم کے رذیل صرف اس لئے ملازم رکھے جاتے تھے کہ وہ آتے جاتے ہر شریف کی سر عام پگڑیاں اچھالتے رہیں۔ کبھی کسی کے جسم پر نالی کی غلاظتیں پھینک دی جاتیں، کبھی کسی کے سر پر گوبر کی ٹوکری ڈال دی جاتی۔ رذیل آج بھی یہی کام کر رہے ہیں اور شریف بقول شاد عظیم آبادی

''شریف الجھیں اگر کسی سے تو پھر شرافت کہاں رہے گی''

کچھ لوگ ہر مقام، ہر عزت اور ہر عہدے کا حق دار صرف اور صرف اپنے آپ کو سمجھتے ہیں، وہ دوسروں کا وجود برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں سے صرف ہمدردی کی جا سکتی ہے۔ محض دوسروں کیلئے کڑھ کڑھ کر یہ جلن اور حسد کی آگ میں خود کو جلا کر اپنی ہی زندگی کے چراغ کی لو کم کرنے میں لگے ہیں۔ قابل رحم ہیں یہ لوگ۔

وہاب اشرفی اپنے مخالفوں، نکتہ چینوں، اور مخالفتوں کو بہت ہلکے انداز میں لیتے ہیں، لکھنے پڑھنے کے معاملے میں انتہائی سنجیدہ اور ذکی الحس واقع ہوئے ہیں، علم کی پیاس انہیں ہر وقت بے

جیبں رکھتی ہے۔ وہ قرض لے کر کتابیں خریدنے پر یقین رکھتے ہیں، کوئی اچھی اور نایاب کتاب نظر آئی، وہاب اشرفی نے اس کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ مرحوم کلام حیدری کہا کرتے تھے، میں صرف انہیں کے قول کو حدادت کے ساتھ دہرار ہا ہوں کہ کسی نئی کتاب کی جھلک وہاب کو دکھلانا خطرے سے خالی نہیں، آپ ذرا غافل ہوئے اور کتاب غائب۔ کلام حیدری ان کے بے تکلف دوستوں میں تھے، ہوسکتا ہے اس کا یہ تجربہ رہا ہو، ہم تو نہ ایسے شوقین ہیں، نہ دانا، نہ ہوشیار، ہم اس سلسلے میں کیا کہیں۔ البتہ وہاب اشرفی نے اپنے ذاتی کتب خانے میں جو بیش قیمت اور نایاب ہیرے جمع کر رکھے ہیں، انہیں دیکھ کر رشک ضرور آتا ہے۔ لکھنے پڑھنے میں ان کا زیادہ وقت پہلے بھی صرف ہوتا تھا، آج بھی ہوتا ہے۔ پڑھنا اور لکھنا ان کے لئے کبھی بچّوں کا کھیل نہیں رہا۔ وہ جو کچھ پڑھتے ہیں اسے بخوبی ہضم بھی کرتے ہیں۔ ان کے خیالات وافکار کبھی گنجلک اور الجھے ہوئے نہیں رہے۔ وہ دوٹوک اور صاف لہجے میں اپنی بات کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے گہری سوچ ہوتی ہے اور عمیق مطالعہ

یہ ان کی نہیں، اردو تنقید کی خوش نصیبی ہے کہ وہاب اشرفی کی نگاہیں صرف اردو کی چہار دیواریوں تک محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بہت آگے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مغربی ادب اور اس کی رفتار سے تو وہ بخوبی واقف ہیں ہی مشرقی ادب کی چاپ بھی ان کی قوت سماعت میں سمٹی رہتی ہے۔ بے شمار تنقیدی مضامین کے علاوہ انہوں نے عالمی ادب سیریز کے سلسلے میں جو کچھ کام کیا ہے وہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ جس کی وہ داد انہیں ابھی تک نہیں ملی۔ جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ ان کی خدمات کا رسمی طور پر اعتراف نہیں کیا جانا ایک سانحہ ہے۔ حالاں کہ جینوئن لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ اس سے کسی کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ البتہ دوسرے لوگوں کی تنگ نظری ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی ریاست میں پیدا ہوئے جہاں کی ہ*ارت تاریخ میں جوہر شناسی کا عنصر نہیں پایا جاتا۔

وہاب اشرفی نے کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ اور ہمیشہ بے باکانہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے نظریاتی اختلافات کو کبھی ذاتی نہیں بنایا اور سخت سے سخت مرحلے پر بھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ورنہ آج کل اس زمرے میں دو چار گالیوں کے بغیر تو بات بنتی ہی نہیں۔ جب تک اپنے دل کا بخار کسی بہانے سے نکال نہیں لیا جاتا۔ تشفّی نہیں ہوتی۔

وہاب اشرفی بنیادی طور پر فکشن کے تنقید نگار ہیں، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ فکشن کے سب سے بڑے تنقید نگار ہیں (یہ رائے ابھی تک سفید کاغذ پر آنے کا شرف حاصل نہیں کر سکی

ہے!) وہ ان چند لوگوں میں ہیں جنہوں نے برسوں قصہ کہانیوں کی گلیوں کی خاک چھانی ہے، تب کہیں جا کر وہ ہیرے اور پتھر کا فرق جان سکے ہیں۔ انہوں نے اردو فکشن کے جھولے میں چند ایک بہت اچھے افسانے ڈالے ہیں، وہ افسانے وقت کے کس اسار میں دب گئے، کچھ پتہ نہیں۔ اس صورت حال کے لئے خود وہاب اشرفی بھی کم ذمہ دار نہیں۔ خود آگہی کبھی کبھی بہت تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے پتہ نہیں کیا سمجھ کر ان موتیوں کو پتھر جان کر اپنے خزانے سے باہر پھینک دیا۔ آج سے بیس بائیس سال پہلے ان کے ذہن میں یہ خیال کوندا تھا کہ ان بکھرے موتیوں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کر دیا جائے لیکن پھر ہوا یہ کہ دوسری دنیاؤں کی چمک دمک انہیں کھینچ لے گئی ورنہ جس شخص نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا ہو، اس کا خاتمہ صرف اور صرف تنقید نگاری پر ہو، اسے ہم کس کا المیہ مانیں ؟

وہاب اشرفی کا ؟

اردو ادب کا ؟

یا ہم سب کا ؟

محفل کو زعفران زار بنانے کا جو فن وہاب اشرفی کو آتا ہے وہ کسی کو نہیں آتا۔ اس وقت ان کے چہرے کی رنگت بدل جاتی ہے۔ جغرافیہ تبدیل ہو جاتا ہے، آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تیر نے اپنے شکار کی بو سونگھ لی ہے۔ لیکن تیر صاحب کا نشانہ ہوتا ہے اپنی ذات وہ جی بھر کے اپنے آپ پر ہنس لیتے ہیں اور دوسروں کو ہنسنے پر مجبور کر لیتے ہیں۔ پھر کسی اور بات کی نوبت آتی ہے۔ وہ جس محفل میں موجود ہوں، مرکزی مسند اس کے لئے محفوظ رہتی ہے۔ انہیں خواہ مخواہ رہ رہ کے یہ بے جا احساس ستاتا رہتا ہے کہ ان کا چہرہ پرکشش نہیں، ان کی پرسنالٹی دبی دبی سی ہے۔ پرکشش دکھائی دینے اور شخصیت میں ابھار پیدا کرنے کے لئے وہ ''ڈنٹنگ پینٹنگ'' (یہ الفاظ انہیں کے ہیں) کا سہارا لیتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ وہ جس پرکشش شکل اور نمایاں شخصیت کے مالک ہیں، وہ انہیں لاکھوں میں ممتاز کرتی ہے۔ انہیں کسی بیساکھی کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اگر وہ ایک پرکشش شخصیت کے مالک نہ بھی ہوتے جو وہ یقیناً ہیں، پھر بھی وہ وہاب اشرفی کی حیثیت سے ہی جانے جاتے اور یہ حیثیت لاکھوں پر بھاری ہوتی۔ گاندھی جی کو ان کی لنگوٹی کے تعلق سے کوئی یاد نہیں کرتا، وہ مہاتما گاندھی کی حیثیت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔

☆☆☆

عبدالواسع

ہوا دیوانہ ہر فرزانہ تیرا

وہاب اشرفی کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ وہ افسانہ نگار، مدیر صنم، ریسرچ اسکالر، استاد، مصنف، محقق، ناقد، تبصرہ نگار، مقدمہ نویس، فاتح ادبی معرکہ، صدر شعبہ اردو، ادیب شہیر، دانشور، ایڈمنسٹریٹر، خاوند، چار ذہین بیٹوں کے باپ، رشتہ داروں کے ہمدرد اور مددگار، قابل اعتماد دوست، دشمنوں کے دوست، خلیق، منکسر المزاج، مہمان نواز، ولدار، فیاض، بے دریغ خرچ کرنے والا، مدبر، مصلحت کوش، مصلحت بیں، پر مزاح، راضی بہ رضا، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، درویش صفت اور بہت سے دوسرے اوصاف حمیدہ کے مالک۔ ان کا شمار میری عجز بیانی کے سب نہیں ہوا مگر ہر وصف اتنا روشن اور درخشاں ہے کہ تفصیل میں جائیں تو ہر پر الگ سے ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے اور کسی کسی پر لکھی بھی گئی ہے۔ خوش قسمتی سے میں ان کا قریبی دوست ہوں اور ان تحصیت کے ظاہر و باطن سے واقف ہوں مگر سخت مشکل میں ہوں کہ کس بات کو ظاہر کروں اور کہاں رک جاؤں۔ فی الحقیقت بعض شخصیت اتنی دلکش، دلنواز، جاذب نظر اور صد رنگ ہوتی ہے کہ تمام رنگ بیک وقت گرفت میں نہیں آسکتے۔ بہت کچھ لکھنے اور بیان کرنے کے بعد بھی محسوس ہوتا ہے کہ بہت کچھ لکھنے اور بیان کرنے سے رہ گیا ہے۔ میرے خیال میں غالب اسی کیفیت سے دو چار ہوئے ہوں گے جب جو شعر میں یوں ڈھلا

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

عمر رفتہ کو آواز دیتا ہوں تو بیالیس سال قبل کا ایک منظر نظروں میں گھومتا ہے جب راقم السطور شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسیٹی کا طالب علم تھا اور اقبال ہاسٹل میں رہتا تھا۔ تب وہاب اشرفی ایل آئی سی میں کام کرتے تھے، افسانہ لکھتے تھے اور ماہنامہ ''صنم'' نکالتے تھے۔ ہر مہینے کے اختتام پر ہاسٹل میں پر تکلف دعوت کا اہتمام ہوتا تھا۔ ایسی ہی ایک دعوت میں پہلی بار میں نے وہاب اشرفی

کو دیکھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ کھانے کی میز پر محوِ گفتگو تھے اور اپنی لطیفہ گوئی سے محفل کو زعفران زار بنا رہے تھے۔ اگرچہ میری ان سے باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی مگر میں نے ان کی ذہانت، نرم گفتاری اور کشادہ پیشانی سے قیاس کیا تھا کہ ایک روز ناموری اور کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ وہاب اشرفی کو جو ناموری اور کامیابی حاصل ہوئی اس باعث بہت لوگ ان سے حسد کرتے ہیں مگر میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا بلکہ ان کی کامیابی اور ناموری کے پس پشت ان کی سخت محنت اور جانفشانی کو دیکھتا ہوں تو یقین ہوتا ہے کہ سچی محنت اور لگن انسان کو کس طرح کامیاب کرتی ہے۔ اس قاعدہ کلیہ کے روشن مثال وہاب اشرفی ہیں۔ انہوں نے ایل آئی سی کی ملازمت کو ترک کیا، ایم اے اردو کا امتحان دیا، فرسٹ کلاس فرسٹ ہوئے اور یو جی سی فیلوشپ لے کر مظفر پور میں ایل ایس کالج کے شعبۂ اردو میں جوائن کیا اور اپنی زندگی کا رخ بدل دیا مگر ہمیشہ اپنے سامنے ایک نشان رکھا جس کو حاصل کرنے کے لئے ذہنی، جسمانی، سیاسی ہر قسم کی جائز کوشش کی اور جب تک کامیاب نہ ہوئے دم نہیں لیا۔ ان کی کامیابی دراصل ان کی جانفشانی اور کڑی محنت کا ثمرہ ہے۔

وہاب اشرفی جب مظفر پور آئے تو میں ایک سال قبل سے شعبۂ اردو، ایل ایس کالج، مظفر پور میں لکچرر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ان کے حسن اخلاق، اخلاص، ذہانت اور علمیت سے بہت متاثر ہوا اور جلد ہی ان کا دوست ہو گیا۔ میری طرح شعبے کے دوسرے جوان اساتذہ مثلاً پروفیسر متین احمد صبا، پروفیسر نجم الہدیٰ وغیرہ بھی ان کے دوست ہو گئے۔ اس طور پر ہم دوستوں کی ایک چوکڑی بن گئی جس میں بعد میں دو ایک صاحبان اور شامل ہو گئے۔ وہاب اشرفی اچھے افسانہ نگار اور استاد تو تھے ہی جہاندیدہ بھی تھے چنانچہ ہم جیسے تازہ واردان بساط ہوائے دل کے رہبر و رہنما ہو گئے۔ ان کی سرکردگی میں زندگی اور یونیورسٹی کے کئی معرکے ہم نے سر کئے۔ وہ اپنی شیریں گفتاری سے بہت جلد اپنے مخاطب کو رام کر لیا کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں کوئی چھوٹا موٹا کام ہوتا ہم ان کے ساتھ جاتے اور منٹوں میں کام بن جاتا۔ وہاب اشرفی عام طور سے مخاطب کے مزاج اور موڈ کو دیکھ کر بات کرتے ہیں مگر جب ان کی عزّت نفس پر ضرب لگتی ہے تو تلملا اٹھتے ہیں اور ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں۔ البتہ اس عمل میں بھی ان کا لہجہ نرم ہوتا ہے اور مزاح کی چاشنی جواب میں گھل جاتی ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ فیلو ہوتے ہوئے انہوں نے فارسی میں ایم اے کا امتحان دیا اور اردو کی طرح اس میں بھی فرسٹ کلاس فرسٹ ہوئے۔ ہم نے اس کامیابی کا جشن منایا مگر شعبہ کے دو ایک بزرگ اساتذہ ان کی کامیابی سے خوش نہیں تھے، چنانچہ ایک استاد نے ان کے سامنے ان کے نتیجے پر اعتراض کیا۔ وہاب اشرفی نے بڑے تیور میں جواب دیا کہ

حضور قبلہ اس امتحان میں اگر آپ بھی شریک ہوتے تو نتیجہ وہی ہوتا جو ہوا۔ اس استاد سے کچھ دنوں تک کبیدہ خاطری رہی پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہاب اشرفی رانچی میں صدر شعبہ تھے تو وہی استادان کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے۔ اس واقعے سے یہ تو روشن ہوتا ہی ہے کہ وہاب اشرفی صاف دل انساں ہیں، رنجش نہیں پالتے۔ جو واقعہ جب اور جہاں ہوا اسی لحہ اور اسی مقام پر چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی کامیابی اور ناموری کا ایک رار یہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون کے آغاز میں، میں نے وہاب اشرفی کو دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا بھی دوست کہا ہے۔ رندگی ہے تو بہت سے لوگوں سے دوستی، دشمنی، محبت اور نفرت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے مگر عظیم وہ ہے جو ان سے متاثر نہ ہو اور رندگی کو اپنے طور پر چلنے دے۔ وہاب اشرفی چار برسوں تک یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیئرمین رہے۔ لگ بھگ چودہ سو لکچرار کی بحالی کی، تقریباً تین سو پرنسپل مقرر کئے اور اندازاً پندرہ ہزار اساتذہ کی ترقی کی سفارشیں کیں۔ ظاہر ہے ان میں بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جن سے وہاب اشرفی کو تکلیف پہنچی ہوگی اور ان سے وہ خفا بھی ہوں گے مگر اس کا اظہار انہوں نے اپنے کسی عمل سے نہیں کیا بلکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کا کام انہوں نے اپنے دوستوں کے مقابلے میں ریادہ تندہی اور دلچسپی کے ساتھ کیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض معاملات کو لے کر مجھے ان سے سخت اختلاف ہوا اور رنجش بھی ہوئی مگر انہوں نے بڑی ہوشیاری سے میری دلداری کر کے اس کو ختم کیا اور اپنے حلقہ مریداں میں شامل رکھا۔ ان باتوں پر غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حصے میں جو ناموری، کامیابی اور سرفرازی دوسروں کے مقابلے میں آئی ہے، بے سبب نہیں۔ ان کا ظرف عام لوگوں سے بڑا ہے۔ اس لئے ان میں صبر وتحمل، درگزر کرنے، برداشت کرنے، دلنوازی اور دلداری کے عناصر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ ساتھ ہی مزاح کے پردے میں حق بات کہنے کی بھی۔ حق کو حق کہنا آسان نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہاب اشرفی میں یہ اخلاقی جرأت ہے مگر حق کو حق کہنے کے دوران ان کا طرز تخاطب بہت شیریں اور پرمزاح ہوتا ہے۔ چنانچہ جس کے تعلق سے وہ حق کی نقاب کشائی کرتے ہیں وہ بدحظ نہیں ہوتا۔ یہ ایسی ہنرمندی ہے جو وہاب اشرفی اور اں جیسے لوگوں سے مختص ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

ایک موقع پر پروفیسر نجم الہدیٰ کو اتنی سخت بات کہی کہ دوسرا کوئی کہتا تو پروفیسر نجم الہدی

بولنے والے کا دماغ چاٹ جاتے یا کپڑے پھاڑ کر جنگل کی راہ لیتے۔ پروفیسر نجم الہدیٰ کی والدہ کا ان کے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا اور ان کے والد نے دوسری شادی کی تھی۔ پروفیسر نجم الہدیٰ اپنے والد کی غیر معمولی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ انہیں ٹیلی گرام بھی بھیجتے تو نام کے قبل والد صاحب بزرگوار وغیرہ لکھتے۔ ہم انہیں لاکھ سمجھاتے کہ یہ حرکت ٹیلی گرام کے مقاصد کے منافی ہے مگر وہ نہیں مانتے تھے بلکہ جواباً کہتے تھے کہ دو آنے کی خاطر میں اپنے والد صاحب قبلہ کی قدر و منزلت میں کمی نہیں آنے دوں گا۔ بہر حال پروفیسر نجم الہدیٰ کا رشتہ شہر کے ایک ذی حیثیت خانداں سے آیا۔ فیصلہ ان کے والد کو کرنا تھا۔ والد صاحب قبلہ تشریف لائے اور اسے نامنظور کر دیا۔ وہاب اشرفی کو جب معلوم ہوا تو بہت فکرمند ہوئے اور پروفیسر نجم الہدیٰ سے کہا کہ ان کی شادی اس وقت تک نہیں ہو گی جب تک ان کے والد صاحب قبلہ زندہ ہیں کیونکہ وہ لڑکی تو اس کے لئے دیکھنے جائیں گے اور شادی خود کریں گے۔ ایسا کہنے کی وجہ یہ تھی کہ اسی زمانے میں مظفر پور شہر کے ایم ایل اے (بعد میں منسٹر) اپنے بیٹے کے لئے جس لڑکی کو پسند کرنے گئے اس کو اپنی بیوی بنا کر لے آئے۔ اس واقعے کے بعد بھی پروفیسر نجم الہدیٰ اور وہاب اشرفی دوست رہے بلکہ بعض موقعوں پر وہاب اشرفی نے پروفیسر نجم الہدیٰ کی بے دریغ مدد کی جس کا میں گواہ ہوں۔

وہاب اشرفی مظفر پور میں لگ بھگ پانچ سال رہے مگر انہوں نے اپنی شخصیت کی بڑی گہری چھاپ چھوڑی۔ مظفر پور سے ان کے جانے کے بعد اساتذہ، طلباء اور اہل علم حضرات انہیں برابر یاد کرتے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اساتذہ، طلباء اور اہل علم حضرات کے دل میں تصنیف و تالیف سے خصوصی دلچسپی پیدا کی۔ ان کی پہلی تصنیف ''قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ'' مظفر پور میں لکھی گئی اور یہاں سے ہی شائع ہوئی۔ بعد میں اس کے ایڈیشنز دوسری جگہوں سے شائع ہوتے رہے۔ ان کی تحریک پر ہم اساتذہ اور طلباء اپنے ذوق کے مطابق شعر کہنے لگے، افسانہ لکھنے لگے یا تنقیدی مضامین قلمبند کرنے لگے۔ اس طور پر یکایک مظفر پور کا ادبی ماحول متحرک ہو گیا۔ یہ سب ہو رہا تھا مگر بعض بزرگ اساتذہ خوش ہونے کی بجائے ناراض رہتے تھے۔ وہاب اشرفی کی پہلی تصنیف ''قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ'' شائع ہو کر آئی تو ایک استاد نے طنزاً کہا کہ یہ کتاب قلم سے نہیں قینچی سے لکھی گئی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کسی موقع سے پروفیسر عبدالمغنی مظفر پور آئے تھے۔ ان کے اعزاز میں وہاب اشرفی ایک نشست کرنا چاہتے تھے۔ ایک بزرگ استاد سے مشورہ کرنے گئے اور آنکھوں میں آنسو لئے لوٹے۔ معلوم یہ ہوا کہ بزرگ استاد نے تجویز مسترد کر دی۔ میں نے ان کی دلدہی کی، ڈھارس بندھائی اور نشست کرنے پر اصرار

کیا۔ نشست ہوئی اور کامیاب ہوئی۔ اس واقعے کے بعد نہ معلوم کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ بزرگ استاد مجھ سے بھی خفا رہنے لگے حالانکہ میں ان کا شاگرد ہوں اور کبھی پاس ادب سے غافل نہیں ہوا ہوں۔ وہاب اشرفی نے مظفر پور کے ادبی اور تدریسی ماحول میں کس طرح جان ڈالی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ۱۹۶۶ء میں ان کے ساتھ چھ اساتذہ کو ایک ساتھ ڈی لٹ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ میں نے اس وقت تک رجسٹریشن بھی نہیں کرایا تھا حالانکہ استاذی پروفیسر اختر قادری مرحوم برابر تاکید کرتے تھے۔ بہر حال میں نے پی ایچ ڈی کرنے کا فیصلہ کیا۔ موضوع کا انتخاب، کتابوں کی فراہمی، مسودہ کی تیاری، ہر منزل پر وہاب اشرفی نے میرا بھرپور تعاون کیا اور دو برسوں کے اندر میں نے اپنا مقالہ مکمل کر لیا اور وقت مقررہ پر داخل دفتر کیا۔ میرے مقالے کا موضوع ''بہار میں اردو سوانح نگاری'' ہے۔ اس میں، میں نے بہار کی سوانح عمریوں کا تنقیدی جائزہ لیا اور معروضی فیصلے دیئے۔ ان میں فوق بلگرامی کی سوانح عمریاں بھی شامل ہیں جو بیشتر ائمہ حضرات کی زندگیوں پر مبنی ہیں۔ میرے ایک ممتحن پروفیسر احتشام حسین مقرر ہوئے۔ مجھے ڈر ہوا کہ وہ مقالے کو مسترد نہ کر دیں۔ وہاب اشرفی نے مجھے دلاسہ دیا کہ پروفیسر احتشام حسین ترقی پسند نقاد ہیں ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ جب رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ وہاب اشرفی انسانی نفسیات کے ماہر ہیں کیونکہ پروفیسر احتشام حسین نے نہ صرف یہ کہ ڈگری تفویض کرنے کی سفارش کی بلکہ مقالے کی تعریف و تحسین بھی کی۔ بحمد اللہ میرا یہ مقالہ بہار اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ پانچ سو کاپیاں تین برسوں میں نکل گئیں۔

وہاب اشرفی لکچرر، ریڈر، صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اردو، ہندوستان گیر شہرت کے مالک، مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب کمیٹی، موڈریشن بورڈ، پی ایچ ڈی کے اگزامنر، اکیڈمک کاؤنسل، سلیکشن کمیٹی کے ممبر ہوئے اور بہت مصروف رہنے لگے۔ ہمیشہ سفر پر رہا کرتے تھے مگر ان کے شوق مطالعہ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہمیشہ نئی کتابوں کا پتہ کرتے اور اس کے حصول میں دل و جان سے لگ جاتے۔ کتابوں کی دکانوں میں، فٹ پاتھ پر کتابیں بیچنے والوں سے اور اہل علم و ذوق حضرات سے دریافت کرتے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے ہیں جب تک وہ ان کو حاصل نہ ہو۔ درحقیقت کتابیں ان کو صحت مند رکھتی ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ کتابیں نہ ہوں تو جینا دوبھر ہو جائے۔ بیس برسوں سے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہیں مگر شوق مطالعہ کبھی کم نہ ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کتابیں ان کی طاقت ہیں، جسمانی اور ذہنی دونوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ کتابیں

پڑھتے پڑھتے وہ لکھنے لگتے ہیں۔ اس عالم میں وہ مکمل سکون چاہتے ہیں۔ اس لئے لکھنے کا کام زیادہ تر صبح سویرے کرتے ہیں۔ ہمیشہ نئی نئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور وسعت مطالعہ سے ایک زبردست قسم کا عالمانہ مضمون قلمبند کرتے ہیں جو ادبی ماحول میں بھونچال لاتا ہے یا کسی سیمینار میں اپنی علمیت اور واقفیت کا پرچم لہراتے ہیں۔

وہاب اشرفی شعروادب کو عالمی تناظر میں دیکھتے ہیں جو میرے خیال میں درست ہے۔ لوگوں کا کیا ہے لوگ تو ذاتی اور لمحاتی اثرات کے نتیجے میں اپنے نقاط نظر میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں مگر ذاتی اور لمحاتی اثرات عالمی اقدار کو نہیں بدل سکتے۔ عالمی اقدار عالمی تقاضوں کے ماتحت بدلتی ہیں۔ ذاتی اور لمحاتی تقاضوں کے زیر اثر نہیں۔ وہاب اشرفی نہ صرف یہ کہ خود مطالعہ کرتے ہیں بلکہ اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بہت بیش قیمت ہے۔ اس میں لگ بھگ دس ہزار کتابیں ہوں گی۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ مشکل سے کتابیں خرید پاتے تھے۔ مگر کتابیں تب بھی خریدتے تھے۔ ایک بار بولنے لگے کہ طالب علمی کے دور میں کتابیں خرید نہیں پاتا تھا وہی گرہ ہے جو کتابوں کے پیچھے میں بھاگتا رہتا ہوں۔ ان کے کتب خانے میں اردو، انگریزی ادب، کے علاوہ فلاسفی، طب، ہومیوپیتھی اور مذہبیات سے متعلق ہر اہم کتاب موجود ہے۔ لہٰذا ان سے ادبی مباحثے میں بار پانا ممکن نہیں۔ جنہوں نے کوشش کی منہ کی کھائی۔ ایک زمانہ میں رسالہ ''مورچہ'' (گیا) کے صفحات پر محمود ہاشمی سے ان کی ٹھن گئی۔ انہوں نے محمود ہاشمی کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ منہ کے بل گرے اور دوستی کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس ادبی بحث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاب اشرفی کا مطالعہ کتنا گہرا و وسیع ہے۔ محمود ہاشمی بار پا نہ سکے لیکن یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ دونوں آج بھی گہرے دوست ہیں۔ اس ادبی مباحثے کی کتاب ''معرکۂ وہاب اشرفی و محمود ہاشمی'' شائع ہوگئی ہے، مرتب ہیں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم۔

وہاب اشرفی بہار میں ہوں یا بہار سے باہر ہوں ہمیشہ اور ہر جگہ موضوع گفتگو رہتے ہیں۔ ان سے متعلق کوئی لطیفہ یا ان کا کوئی لطیفہ، ان کی علمیت کا اقرار یا ان کے مضامین کی تحسین کوئی نہ کوئی بات ان کے تعلق سے ان کے غائبانہ میں ہوتی رہتی ہے۔ ایک بار میں کسی پی ایچ ڈی وائیوا کے سلسلے میں مگدھ یونیورسٹی گیا، گیا ہوا تھا۔ میرے آنے کے دو ایک روز قبل وہاب اشرفی کسی کے وائیوا میں آکر جا چکے تھے۔ چنانچہ دوران گفتگو ڈاکٹر حسین الحق نے وہاب اشرفی سے متعلق کوئی بات کہی۔ میں نے جواباً کچھ عرض کیا۔ نہ معلوم کیسے اور کیوں ڈاکٹر حسین الحق نے کہا

کہ آپ کی ان سے ان بن تو نہیں ہے۔ میں نے فوراً عرض کیا کہ اس غلط فہمی میں مت رہئے۔ وہاب اشرفی نے اپنے حمایتیوں کی اتنی بڑی بھیڑ جمع کر رکھی ہے کہ جو لڑے گا منہ کی کھائے گا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ساختیات، ردتشکیل اور مابعد جدیدیت جیسے اہم موضوعات پر ان کے عالموں سے وہ اس انداز میں باتیں کرتے ہیں گویا کلاس روم میں لکچر دے رہے ہوں۔ صلاح الدین پرویز نے تو رسالہ ''استعارہ'' میں وہاب اشرفی کو مابعد جدیدیت کا اہم ستون قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے رمز شناس ان کی کتاب ''مابعد جدیدیت ممکنات و مضمرات'' شائع ہو چکی ہے۔

وہاب اشرفی کا کوئی دوسرا نام ہو سکتا ہے تو وہ ہے ''محبت''۔ وہ اپنے رشتہ داروں، بھائی بہنوں، اہلیہ، بیٹوں، بہوؤں اور پوتے پوتیوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ کوئی معمولی تکلیف میں ہو تو وہ بے چین ہو اٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے تمام متعلقین سے بھی اتنا ہی پیار چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی اس میں کمی کا احساس ہوتا ہے تو اندر اندر گھلتے رہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس کو سمجھ آ جائے جو یہ ستم کر رہا ہے۔ ان کے دل میں محبت کا جو سمندر موجیں مارتا ہے وہ صرف ان کے گھر تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے حلقے میں ان کے تمام دوست، احباب اور شناسا ہیں۔ وہاب اشرفی لوگوں کو محبت کا تحفہ دیتے ہیں اور توقع نہیں رکھتے کہ دوسرے بھی انہیں یہ تحفہ بدلے میں دیں۔ دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ بعض ان کے معیار پر پورے اترتے ہیں بعض نہیں، مگر وہ ہر حال میں تن بہ تقدیر رہتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ جب وہ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیئرمین تھے تو انہوں نے دوستوں اور دشمنوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خدمت کر کے بھول گئے۔ لیکن میں نے وہاب اشرفی کی زبان سے کسی کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سنی۔ اتنا بڑا دل کس کے پاس ہے جو نیکی کرے اور دریا میں ڈالے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ وہاب اشرفی مجسم اخلاص اور محبت کا پیکر ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور صحت مند رکھے۔

اس میں شک نہیں کہ ذہانت، علمیت اور دانشوری کے بل بوتے پر شعر و ادب کی دنیا میں نام پیدا کرنے والوں میں وہاب اشرفی کا نام زریں حروف میں لکھا جائے گا۔ ''قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ'' سے انہوں نے تصنیف و تالیف کا سفر شروع کیا اور ''شاد کی نثر نگاری''، ''قدیم ادبی تنقید''، ''معنی کی تلاش''، ''کاشف الحقائق کا تنقیدی جائزہ''، ''آگہی کا منظر نامہ''، ''راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری''، ''تفہیم البلاغت''، ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ''، ''تاریخ ادبیات عالم'' وغیرہ مقبول عام اور مقتدر کتابیں تصنیف کر کے اپنے تنقیدی شعور، وسیع مطالعہ، ژرف بینی،

عالمی ادب پر گہری نظر اور خلاقانہ قوت کا بے نظیر مظاہرہ کیا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان کتابوں کی تعریف و تحسین قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، گوپی چند نارنگ، محمد حسن اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے مستند اور عظیم مگر متضاد فکر و نظر کے حامل عالم، محقق، ناقد اور دانشور نے کی اور اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے انہیں قابل اعتنا قرار دیا۔ غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی علمیت اور دانشوری کے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ آخر یہ کار دشوار ہوا کیسے؟ جواب ہے کہ یہ سب وہاب اشرفی کی قلندری اور درویش صفتی کے طفیل ہوا۔ وہاب اشرفی اکثر اپنے خاندان کے بزرگوں کی قلندری اور درویشی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں اور اپنی کامیابیوں کو ان کی نیک دعاؤں کا ثمر قرار دیتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے اپنی قلندری اور درویش صفتی کا مظاہرہ صرف شعر و ادب کی دنیا میں ہی نہیں کیا بلکہ بہار کی بساط سیاست پر بھی اس کا باکمال مظاہرہ کیا اور اپنے حریفوں کو شکست فاش دی۔ یونیورسیٹی سروس کمیشن کی چیئرمینی کے لئے منتخب کئے جانے، پرنسپل اور لکچررز کی تقرری کرنے سے لے کر بہار انٹرمیڈیٹ کاؤنسل کے چیئرمین ہونے تک ہر جگہ انہوں نے سیاست کے کئی قطبوں کو ایک رسّی میں باندھ کر رکھا اور بہت پر وقار طور پر ہر کام کو حسن و خوبی سرانجام دیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو سپر ڈال دیتا مگر وہاب اشرفی نے مشکل سے مشکل گھڑی کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور منزل مقصود پا کر ہی چین کی سانس لی۔

میں نے قبل لکھا ہے کہ وہاب اشرفی صد رنگ شخصیت کے مالک ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی شخصیت کے تمام اوصاف کو ضبط تحریر میں لانا میرے جیسے کم علم اور عاجز بیان کے لئے ممکن نہیں پھر بھی میں نے جستہ جستہ ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی طرف نگاہ ڈالی ہے، جن کی تفصیل کا متحمل یہ مختصر مضمون نہیں ہوسکتا۔ لوگ جانتے ہیں وہاب اشرفی میرے دوست بھی ہیں اور سمدھی بھی۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ تمام امور کو معروضی طور پر سمیٹ لوں، کہاں تک میں **Objective** رہا ہوں اس کا اندازہ وہ لوگ زیادہ کریں گے جو وہاب اشرفی سے قریب رہے ہیں اور ان کے علمی، ادبی اور سماجی کیف و کم سے واقف ہیں۔ مگر میں تو یہی کہوں گا کہ

بلائے جہاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

شمس الرحمٰن فاروقی

وہاب اشرفی کی ''تاریخ ادبیات عالم''

قاموسی تصانیف اور مصنفین کا ذکر ہوتو ہمارا ذہن عام طور پر فرانسیسی قاموس نگاروں (Encyclopadists) خاص کر پیئر بیل (Pierre Bayle) کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ بیل نے اپنی "Historical and Critical Dictionary" کا پہلا ایڈیشن ۱۶۹۷ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا اور کثرت سے اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۷۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔ پانچویں ایڈیشن (۱۷۴۰ء) تک پہنچتے پہنچتے اس کی چار ضخیم جلدیں بن گئی تھیں۔ مزید حک و اضافہ اور حواشی و استدراکات کے ساتھ یہ قاموسی لغت (جسے انسائکلو پیڈیا کہنا بہتر ہوگا) پیرس سے سولہ جلدوں میں (۱۸۲۰ء تا ۱۸۲۴ء) اے جے کیو بشو (A J Q Beuchot) کی تدوین و نگرانی میں شائع ہوئی۔ اس وقت تک فرانس کے مشہور روشن خیال عالم، فلسفی، ناول نگار اور ڈراما نگار دنی دیدرو (Denis Diderot) کی تالیف اور نگرانی میں اس کی مشہور زمانہ قاموس بہ عنواں "Encyclop'die" (پینتیس جلدیں، ۱۷۵۱ء تا ۱۷۸۰ء) اور انگریزی کی "Encyclopaedia Brittanica" (تین جلدیں س ۱۷۷۱ء) منظر عام پر آ چکی تھیں۔ ان کتابوں، خاص کر دیدرو کی انسائکلو پیڈیا نے (اور بعض معاملات میں بیل کی Dictionary نے اس سے بھی زیادہ) مغرب میں روشن فکری اور آزاد خیالی کی روایت کو فروغ دیا۔ دیدرو کی انسائیکلو پیڈیا کی اہمیت اور وقعت کا کچھ اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ روسو، والٹر اور مانٹسکیو (Monstesquieu) جیسے لوگ اس کے قلمی معاونین میں تھے۔ مشہور سائنس داں اور ریاضی داں ژاں والامبیئر (Jeand'Alembert) نے اس کا دیباچہ اور اعلانیہ لکھا تھا جس میں اس نے مختلف علوم وفنون کی فلسفیانہ اور علمی تعریفیں قلم بند کی تھیں۔ (ولامبیئر کی یہ تحریر الفارابی کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن اس وقت تک مغرب و مشرق دونوں ہی جگہوں کے لوگ الفارابی کو بھول چکے تھے۔ الفارابی نے D'Alembert کے کوئی نو سو برس

پہلے اپنی کتاب ''احصاء العلوم'' میں تمام علوم وفنون کی درجہ بندی کی تھی اوران کی تعریفیں متعین کی تھیں۔ الفارابی کے دوسو برس بعد Gundisalvus نے اسی موضوع پر اپنی کتاب لکھی اور الفارابی کا حوالہ دیئے بغیر اس کے سارے دلائل واستدلال کو اپنا لیا۔ خیر وہ الگ بات ہے۔)

بیل (Bayle) کی کتاب کی اہمیت اب زیادہ تر تاریخی ہے، لیکن وہ اس لحاظ سے یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ایک اکیلے شخص کی تصنیف ہے، جب کہ ایسی کتابیں عام طور پر کئی علماء مل کر لکھتے اور لکھواتے ہیں۔ پہلے زمانے میں علم اتنا بسیط نہ ہوا تھا اور معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی آج سے بہت کم تھے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگوں کی ہمتیں بھی زیادہ تھیں۔ انیسویں صدی کے اوائل تک یہ عالم تھا کہ کولرج کو توقع تھی بلکہ دعویٰ تھا، کہ وہ تمام علم (all knowledge) کو اپنی مملکت یا دائرۂ کار (Province) بنا لے گا۔ مغرب میں پہلی کتاب جو کئی لوگوں نے مل کر تیار کی وہ جیمس اوّل شاہ انگلستان کے حکم سے تیار کیا گیا انجیل کا ترجمہ تھا جس کی تکمیل میں کوئی پچاس علماء شریک تھے۔ یہ ترجمہ ۱۶۱۱ء میں شائع ہوا اور آج بھی انجیل کے King james 'Bible Authorised Version کے نام سے مقبول ہے۔ چند برس ہوئے علماء کی ایک نئی ٹیم نے دوسرا ترجمہ تیار کیا جسے کلیسائے انگلستان کی منظوری بھی حاصل ہوگئی، لیکن ۱۶۱۱ء والا ترجمہ ادبی حسن کے اعتبار سے شاہکار قرار دیا جاتا ہے اور ادب کے طالب علم اسے ہی پڑھتے ہیں۔

مغرب میں قاموسی مصنفین کا دور دورہ اٹھارویں صدی کے بعد ختم ہو گیا۔ اکا دکا مثالیں (مثلاً کارلائل کی "A history of fredericle the Great" چھ جلدیں جن کے لکھنے میں چودہ سال اور چھپنے میں سات سال ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۵ء لگے) مستثنیات سے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانکا کی شہرت اور مقبولیت کے باعث ہم میں سے اکثر یہی سمجھتے ہیں کہ قاموسی تصانیف کا چلن مغرب سے شروع ہوا، اور یہ کہ ایسی زیادہ تر تصانیف کئی علماء کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ قاموسی تصانیف کا چلن عربوں میں سب سے پہلے عام ہوا، اور مشرق میں ایسی زیادہ تر تصانیف مشترکہ نہیں، بلکہ تنہا شخصوں کی محنت کا ثمرہ ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں تو ایسی کتابیں، خاص کر لغات، ہمارے زمانے تک عام رہیں۔ اٹھارویں صدی کا عظیم الشان فارسی لغت ''بہارِ عجم'' (ٹیک چند بہار)، انیسویں صدی کا وسیع و بسیط فارسی لغت فرہنگ آنند راج، (محمد پادشاہ) اور اُردو لغت ''فرہنگ آصفیہ'' (مولوی سید احمد دہلوی) اور بیسویں صدی کا مبسوط اُردو لغت ''نور اللغات'' (نور الحسن نیّر کاکوروی) اور پھر ''مہذب اللغات''

(مہذب لکھنوی) ایسے کارنامے ہیں جن کو انجام دینے کیلئے آج کئی کمیٹیاں بھی ناکافی ہوں گی۔

عربوں کے کارنامے تو ان سے بھی زیادہ وقیع ہیں اور وہ صرف لغت تک محدود نہیں۔ ہم محدثین، ماہرین اسماء الرجال اور مغربی سے قطع نظر بھی کرلیں تو بھی علمی کارناموں کا دریائے زخار ہے جو اکیلے مصنفوں کا مرہون منت ہے۔ طبری نے اپنی تاریخ کی مکمل بیس جلدیں جامع مسجد بغداد میں طالب علموں کو زبانی املا کرائیں۔ طالب علم برسوں تک آتے رہے اور طبری کی زبان سے ورق ورق املا لیتے رہے، درحالیکہ خود طبری کے سامنے ایک کتاب، حوالے یا یادداشت پر مشتمل کوئی کاغذ، بھی نہ تھا۔ جوہانس پیڈرسن Johannes Pederson اپنی کتاب "The Arabic Book" میں لکھتا ہے کہ اس زمانے کے عربوں میں یہ بات عام تھی کہ مصنف اپنی کتاب نہ صرف زبانی املا کرتا تھا۔ اکثر خود بھی اسے از بر کر لیتا تھا تاکہ آئندہ شاگردوں کو بھی سنا سکے۔ اور بہت سے شاگرد بھی پوری پوری کتابیں زبانی یاد کر کے خود مصنف یا استاد کو سناتے تھے اور صحیح صحیح سناد ینے پر مصنف یا استاد سے سند حاصل کرتے تھے۔ ابو یعقوب سکا کی نے انسائیکلوپیڈیا کے طرز کی ''مفتاح العلوم'' چار ضخیم جلدوں میں لکھی اور تفتازانی نے اس کے صرف اس حصے کی، جو علوم بلاغت سے متعلق تھا، شرح ''مطول'' کے نام سے لکھی جو سولہ جلدوں میں آتی ہے۔ ابوالفراج علی الاصفہانی کی ''کتاب الاغانی'' بیس جلدوں میں ہے اور اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شاید پوری دنیا میں اس جیسی اور کوئی کتاب نہ ہوگی۔ ''کتاب الاغانی'' یوں تو عربی گیتوں اور اشعار کی بیاض و انتخاب ہے، لیکن اس میں راگ راگنیوں کی تفصیل، مصنفوں کے حالات، کلام پر تنقیدی رائے، تاریخی تبصرے، وغیرہ سب کچھ ہے۔ ابوالفراج علی الاصفہانی نے اس شاندار تالیف (بلکہ تصنیف و تدوین) کا صرف ایک نسخہ تیار کر کے اسے اپنے مربی سیف الدولہ (جو الفارابی کا بھی مربی تھا) کو پیش کیا۔ سیف الدولہ نے اسے ایک ہزار دینار انعام دیئے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس زمانے کا ایک دینار فرانس کے خیالی طلائی سکے Gold france Coin کے اعتبار سے تیرہ گولڈ فرانک کے برابر تھا اور ایک گولڈ فرانک کی قیمت ساٹھ گرام سونا فرض کی جاتی ہے۔

اب تو نہ وہ تہذیب رہی، اور نہ علم سے وہ لگاؤ اور نہ شاید اس بات کی ضرورت، کہ ''کتاب الاغانی'' جیسی تصنیفات تیار کی جائیں، اب تو Internet کا زمانہ ہے، کہ کمپیوٹر پر بیٹھے بیٹھے آپ Internet کے ذریعہ Worldwide web سے رابطہ قائم کریں اور مغربی دنیا کی اکثر کتابوں، عجائب گھروں میں محفوظ تصویروں یا مخطوطات کا معائنہ و مشاہدہ، ایسے

کمپیوٹر کے پردے پر کرلیں۔لیکن کتابوں کا چلن شاید کبھی ختم نہ ہو، کیونکہ اصل کتاب کی بات ہی اور ہے۔ایک کتاب کا مصنف جس طرح اپنے مطالعے، تجربے اور نقطہ نظر کو اپنی کتاب کے ہر صفحے پر شعوری طور پر منتقل کرتا چلتا ہے، اس میں انسانی رابطے کی گرمی ہوتی ہے، اور وہ گرمی کمپیوٹر کے اسکرین پر نہیں حاصل ہوتی۔نہ ہی یہ ممکن ہے کہ آپ بیک وقت دو تین کتابیں سامنے کھولے ہوئے ہوں اور کبھی ایک کتاب کے حاشئے پر کچھ دیکھ یا لکھ رہے ہوں، اور کبھی کسی اور کتاب پر نظر دوڑا رہے ہوں۔پھر جب جی چاہا کتاب بند کردی اور کوئی اور کاغذ کوئی مسودہ اٹھا کر دیکھنا شروع کردیا۔یہ سب ذاتی لائبریری میں ہی ممکن ہے، کمپیوٹر پر نہیں۔پھر ہمارا اُردو معاشرہ ہے، جہاں اکثر لوگوں کے پاس ٹیلی فون تک نہیں، کمپیوٹر اور Internet سے رابطہ تو دور کی بات ہے۔ ہمارے یہاں کتابوں، حوالے کی کتابوں اور قاموسی کتابوں، ہاتھ کی لکھی یادداشتوں، اس کا چلن ابھی بہت دن رہے گا۔ہاں پوری پوری کتابیں ربانی یاد کرنے والے اب شاید صرف حفاظ قرآن و حدیث ہی رہ جائیں۔

موجودہ حالات میں، جب اُردو میں عام مطالعے کی کتابیں بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی، ان میں مندرج معلومات اکثر باسی یا ارکار رفتہ ہوچکی ہیں، اور اس کے مرتبین نے ذاتی غور و مطالعے کے بجائے تلخیص وتقلید پر اکتفا کی ہے، وہاب اشرفی کی قاموسی کتاب ''تاریخ ادبیات عالم'' نہ صرف بہت بڑی کمی کو پوری کرتی ہے، بلکہ اپنی ذات میں خود ایک وقیع علمی کارنامہ بھی ہے۔ وہاب اشرفی کا علم و مطالعہ بہت وقیع تو ہے ہی، لیکن اتنی ہی اہم بات یہ کہ انہیں ''قاموسیات'' سے ذہنی مناسبت بھی ہے۔ان دنوں، جب بڑے کاموں کے کرنے کی بات کمیٹی اور جلسوں ہی کے ذریعہ ہوتی ہے، لوگوں کو وہ تربیت بھی حاصل نہیں جو قاموسی تصنیفات تیار کرنے والوں کے لئے ناگزیر ہے۔وہاب اشرفی اُردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی کے بھی نہ صرف ایم اے ہیں، بلکہ انگریزی اور فارسی پر ماہرانہ نظر بھی رکھتے ہیں۔اردو کے وہ عالم اور استاد تو ہیں ہی انہوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی "Companions to English Literature" کے طرز پر اُردو ادب کی مبسوط فرہنگ تیار کی ہے اور اڑیسہ سے شائع ہونے والی عالمی ادب کی وسیع و عریض تاریخ کی اُردو جلد کی نگرانی اور نظر ثانی کی ہے۔جدید اُردو تنقید کی پہلی قاموسی کتاب یعنی ''کاشف الحقائق'' کا انہوں نے بطور خاص مطالعہ کیا ہے اور اس کو مدون بھی کیا ہے۔یہ سب اکتسابات ان کی اس صلاحیت پر دال ہیں کہ وہ عالمی ادبیات کی تاریخ لکھنے کے ہر طرح اہل ہیں۔

پچھلے زمانے کا انداز ایسی کتابوں میں یہ تھا کہ مصنف/مصنفین اپنے طور پر رائے یا فیصلے سے احتراز کرتے تھے اور کتاب کو ذاتی رنگ سے دور رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں کتاب صرف ''محفوظ'' بے رنگ معلومات کا ذخیرہ ہو جاتی تھی۔ اس میں اختلافات یا تنازعہ کی گنجائش ضرور کم ہوتی تھی۔ لیکن پڑھنے والے اس تحرک اور گرمی اور ذاتی نقطۂ نظر سے محروم رہتے تھے جو کسی علمی کتاب کی جان ہوتی ہے۔ "The new Princeton encyclopedia of poetry and Poetics" کے جدید ایڈیشن (۱۹۹۳ء) کے دیباچے میں صاف کہا گیا ہے کہ یہ کتاب ''علم، حقائق، نظریات، سوالات اور باعلم فیصلوں'' سے عبارت ہے۔ یعنی یہ کتاب وہ شئے نہیں جسے شبلی نے براؤن کی تاریخ کے حوالے سے اطلاعات کی کھتونی کہا تھا۔ کچھ ایسی ہی بات وہاب اشرفی کی ''تاریخ ادبیات عالم'' کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ یہ محض اطلاعات کی کھتونی نہیں، بلکہ رایوں، فیصلوں اور تجزیوں کی وجہ سے بھی رنگین اور متمول ہے۔ اس کی پانچ جلدیں اب تک سامنے آئی ہیں اور ان میں ذاتی رائے، تجربے، مطالعے اور غور و فکر کا انداز نمایاں ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیں وہاب اشرفی کی ہر رائے سے اتفاق ہو۔ ضروری نہیں کہ انہوں نے ان تمام مصنفوں اور کتابوں اور ملکوں کا ذکر کیا ہو جنہیں ہم قابل ذکر سمجھتے ہوں۔ ضروری نہیں کہ ان کی تقسیم مکانی و زمانی میں تبدیلی کی گنجائش نہ ہو۔ یہ سب فروعی باتیں ہیں، اور وہ کتاب تنقید کی زندہ کتاب ہی نہیں جس سے کسی شخص کو اختلاف نہ ہو۔ اہمیت مصنف کی وسعت مطالعہ کی، اور اس مطالعے کو تجزیاتی طور پر کام میں لانے کی صلاحیت کی ہے۔ ان دونوں اعتبارات سے وہاب اشرفی کی ''تاریخ ادبیات عالم'' ہندوستاں کے علمی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہے۔

علی جواد زیدی

تاریخ ادبیات عالم

پروفیسر وہاب اشرفی اردو کے مستند نقاد اور معتبر ادیب ہیں، جن کا مطالعہ وسیع، نظر معنی یاب اور ذہن دور رس ہے۔ وہ کئی برس سے اور بڑی خاموشی سے ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اور اپنی وقیع تصانیف سے اردو کے تنقیدی اور تحقیقی ادب میں مسلسل اضافے کر رہے ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی تدوین ہے۔ اردو میں اتنے بڑے منصوبے کا تصور ہمت کا کام تھا۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ لکھنے والے کی نظر ادبیاتِ عالم کے ادب پاروں پر ہو اور پھر اس کو حسنِ ترتیب کے ساتھ، اور مربوط طریقے پر اس طرح پیش کیا جائے کہ دنیا بھر کی زبانوں اور ملکوں ملکوں بکھرا ہوا ادبی سرمایہ ہمارے سامنے آ جائے۔ یہ ایک بڑا چیلنج تھا جسے وہاب اشرفی ہی قبول کر سکتے تھے جن کی نظر مشرق و مغرب کے ادب کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ انتخابی صلاحیت بھی ہے جو سمندر کو کوزے میں بند کر سکتی ہو۔

یہ کام انگریزی میں جزوی طور سے کچھ ہوا بھی ہے اور مختلف ترقی یافتہ زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا اور دائرۃ المعارف وغیرہ میں زبانوں کے ادبیات کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جاتی ہے لیکن انہوں نے ایسے شارٹ کٹ راستے اختیار نہیں کئے بلکہ الگ الگ جہاں جہاں سے مواد ملتا گیا، اسے ضروری حد تک اپنے جائزے کے ساتھ قلم بند کرتے گئے۔ کچھ جولین ہاتھورن، جان رسل ینگ اور جان پورٹر لیبرٹن نے بیسویں صدی کے آغاز میں اقوامِ عالم کے ادب کا ایک جائزہ مرتب اور قدیم متوں مہیا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انہوں نے اس سے صرف استفادہ کیا اور بعض متون کا ترجمہ بھی کیا لیکن ان کی کسی دوسری کوشش کا چربہ نہیں ہے بلکہ منظم طریقے پر اقوامِ عالم کے ادب کی مربوط بازیافت کی سمت اردو ادب کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے منصوبہ بند اقدام ہے اور اس کی ابتداء حسن حزم واحتیاط اور حسن آغاز سے ہوئی ہے وہ آئندہ کے لئے فالِ نیک ہے۔ پورا منصوبہ چھ جلدوں میں مکمل ہوگا۔ پہلی دو جلدیں قبل از مسیح کے ادبیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ پہلی جلد میں مصری، اشوری،

یونانی، چینی، عبرانی، کپائی، ہسپانوی، لاطینی، سنسکرت، پالی اور فرانسیسی ادب کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ دوسری اور تیسری جلدیں بھی تیار ہیں۔ باقی تین چار سال میں مکمل ہو جائیں گی اور اہل اردو ادبیاتِ عالم کے جواہر پاروں سے فیض یاب ہو سکیں گے۔

متون کے مختصر تراجم بھی فراہم کئے گئے ہیں اور مرکزی ادبی رجحانات اور ادیبوں اور دانشوروں کے بارے میں مفید اشارات اور تجزیے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس کا مستحق ہے کہ اس کی ہمت افزائی کی جائے۔ علی العموم ایسے کام اجتماعی طور پر کرنے کے ہوتے ہیں لیکن ابھی ہمارے یہاں مل جل کے کام کرنے کی روایت بنی نہیں ہے۔ بیشتر بڑے کام انفرادی طور پر انجام پاتے رہے ہیں۔ یہ مجبوری کا سودا ہے اگر افراد بھی آگے نہ بڑھیں، تو شاید کام شروع ہی نہ ہو۔ وہاب اشرفی صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایسے کام کا بیڑا اٹھایا جس کی انجام دہی کے لئے کئی باہمت ادیب اور محقق ادیب ہوتے تو کیا کہنا تھا۔ کوئی کام رُکا نہیں رہتا اور اُسے تکمیل کی منزلوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ واقعتہ بڑے حوصلے کا کام ہے لیکن وہ یاراں نکتہ داں کو صلائے عام دیتے ہوں یہ بھی نیک نیتی، صفائی اور عالمانہ وقار سے کہتے ہیں کہ ''یہ محض ایک بنیاد ہے۔ حوصلہ مند، وسیع المطالعہ اور زیادہ فعّال افراد اس پر خوشنما محل تعمیر کر سکتے ہیں''۔

اب ادب جماعتوں، علاقوں اور زبانوں کی ملکیت نہیں رہ گیا ہے۔ اسباب و وسائل ترسیل اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ بڑے پیمانے پر لین دین جاری ہے اور دوسرے ملکوں اور زبانوں کے ادب سے دلچسپی خاصی عام ہے۔ اردو میں اس جانب توجہ برابر دی جاتی رہی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تمام ہندی زبانوں میں اردو نے سب سے زیادہ بین ملکی اور بین علاقائی زبانوں کے ادب سے کسبِ نور کیا ہے اور دوسرے کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے ہیں پھر بھی یہ عالمی ادب ایک اتھاہ سمندر ہے، اس کا منتھن کئے بغیر زہر الگ اور امرت الگ نہیں ہو سکتا۔ اس سمندر منتھن کی طرف اشرفی نے جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے اور اس پہلی جلد کے مطالعہ سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس مجموعے میں نشاطِ رُوح کا کتنا ساماں ہے۔

تاریخ انسانی نے جمالیاتی اقدار اور اس کی تشکیل میں جو کردار ادا کیا ہے اس کے افہام و تفہیم کے لئے ادبیاتِ عالم کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ بے حد مددگار ثابت ہو سکتا ہے، ادب ہی نہیں تہذیب کی کہانی بھی ان اَوراق کے بین السطور میں نظر آ جائے گی۔ ہر طرح سے وہاب اشرفی کی یہ قابل قدر تصنیف ہمارے ادب میں ایک مستقل اور پائندہ اضافہ ہے۔ یہ عالمی، انسانی خوابوں کے ارتقائی دھندلکوں میں لپٹی ہوئی داستان اشرفی نے نہایت رواں اور شیریں انداز میں بیان کی ہے، جس سے اس کی دلکشی اور بڑھ گئی ہے۔

مظہر امام

تاریخ ادبیات عالم

وہاب اشرفی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ کلکتہ میں بی اے کے طالب علم تھے اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ ان کی ابتدائی محبتوں میں شامل تھا۔ انہوں نے ٹینی سن کی مشہور نظم "Enoch Arden" کا ایک خوبصورت ترجمہ انہیں دنوں کیا تھا، جسے میں نے اپنے تعریفی نوٹ کے ساتھ کلکتہ کے ماہ نامہ ''معاون'' میں چھاپا تھا جس کی ادارت کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ وہاب اشرفی کی ذہانت و فطانت، ذوق لطیف اور حسِ مزاح نے مجھے شروع سے ہی متاثر کیا اور عمر کے تفاوت کے باوجود ان سے جو دوستانہ بے تکلفی قائم ہوئی وہ آج تک برقرار ہے۔

وہاب اشرفی نے ادبی، علمی اور تدریسی محاذ پر کامیابی کی منزلیں تیزی سے طے کیں اور اب ان کا شمار موجودہ دور کے معدودے چند معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب ''قدیم ادبی تنقید'' کے ''پیش لفظ'' میں کلیم الدین احمد نے انہیں دادِ سخن دی ہے اور اپنے تحقیقی مقالے ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری'' کی داد وہ قاضی عبدالودود جیسے سخت گیر محقق سے بھی پا چکے ہیں۔

وہاب اشرفی کے علمی اور ادبی اکتسابات کا دائرہ وسیع ہے۔ وہ انگریزی، اردو اور فارسی ادبیات میں ایم اے ہیں۔ ان کے حریف بھی انگریزی ادب کے باب میں ان کی وسعت مطالعہ کے قائل ہیں۔ اردو کے اساتذہ میں ان کی اہمیت مسلّم ہے اور فارسی میں ان کی دستگاہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی وجہی کی ''قطب مشتری'' کے جائزے پر مشتمل ایک مختصر کتاب لکھی تھی جس پر بعد میں اضافہ ہوتا رہا اور اب اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعے ''معنی کی تلاش'' (۱۹۷۸ء) سے پہلے ہی تنقید نگاروں کی صف میں جگہ بنالی تھی۔ اپنا مشہور مضمون ''افسانے کا منصب'' انہوں نے اس وقت لکھا جب فن افسانہ کو دوسرے درجے کی صنف قرار دیا جا رہا تھا۔ وہ ''کنکریٹ (Concrete) شاعری'' اور ''نثری شاعری'' پر اظہار خیال کرنے والے اوّلین ناقدوں میں

ہیں۔ بلکہ ''کنکریٹ شاعری'' پر اب تک اردو میں وہاب اشرفی کے ماسوا کسی اور کا سیر حاصل باقاعدہ مضمون نہیں ملتا۔ نثری شاعری پر بھی انہوں نے اس وقت لکھا، جب اس پر کم از کم ہندوستان میں کسی سرکردہ نقاد نے قلم نہیں اٹھایا تھا نہ شمس الرحمٰن فاروقی نے نہ گوپی چند نارنگ نے۔

انگریزی ادب پر عموماً اور اس زبان کے جدید ادب پر خصوصاً اپنی گہری نظر اور وسیع معلومات کی دھاک وہاب اشرفی نے اسی وقت بٹھا دی تھی جب ''مورچہ'' گیا کے صفحات میں محمود ہاشمی سے ان کا مناظرہ ہوا۔ بعد ازاں اس کا شاخسانہ حسن نعیم کے پہلے مجموعۂ غزل ''اشعار'' پر محمود ہاشمی کا وہ جارحانہ تبصرہ تھا جو ''شب خون'' میں شائع ہوا تھا۔ وہاب اشرفی نے نہ صرف اس کا مدلل جواب دیا بلکہ ان مزعومات کو بھی رد کرنے میں کامیابی حاصل کی جو اس وقت بعض ناقدین کا طرۂ امتیاز تھے۔ اس پوری بحث کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔

انگریزی (اور امریکی) ادب کے نمونوں سے ہماری کچھ نہ کچھ واقفیت رہی ہے کیونکہ یہاں انگریزی تعلیم کا رواج رہا ہے۔ مگر دوسری غیر ملکی زبانوں کے ادب کے بارے میں ہمارا علم واجبی سا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چند جرمن، فرانسیسی اور روسی شاعروں اور ادیبوں کے نام اور کام سے اردو کا پڑھا لکھا طبقہ کسی حد تک آشنا ہے۔ وہاب اشرفی عالمی ادب سے اپنے ادب کا تقابلی مطالعہ کرنے اور آفاقی تناظر کی روشنی میں اپنے ادب کی رگوں میں خون تازہ نفوذ کرنے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ اپنے تنقیدی مضامین کے دوسرے مجموعے ''آگہی کا منظر نامہ'' (۱۹۸۹ء) کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں

''ادب کو سڑنا گلنا نہیں ہے تو اس کی تازگی برقرار رکھنا پڑے گی اور اس کے لئے عالمی سطح پر ادبی رویّوں کے تبدل و تغیر پر نگاہ رکھنی پڑے گی اور اس کے لئے وسیع اور گہرے تقابلی مطالعے کا چیلنج قبول کرنا پڑے گا، ورنہ ادبی تفہیم کا لامتناہی پس منظر آنکھوں سے اوجھل رہے گا اور اگر ایسا ہوا تو پس ماندگی مقدر بن جائے گی۔ میرا موقف یہ ہے کہ جہاں ادب کے کچھ مقامی مطالبات ہیں، وہاں آفاقی تناظر بھی اس کا نصب العین ہے۔ کوئی نقاد اس احساس کے ساتھ کچھ لکھتا ہے تو گویا اس کی کاوش ہے کہ وہ اپنے ادب کو نئے رنگ و روغن دے کر اسے عالمی سطح پر لا کھڑا کرے''۔

وہاب اشرفی کا موقف واضح ہے۔ ان کی کتاب ''تاریخ ادبیات عالم'' ان کے تنقیدی اور ادبی موقف پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نقشہ اور منصوبہ انہوں نے بہت پہلے سے بنا رکھا تھا۔ اردو زبان و ادب سے انہیں جو شغف ہے اور اسے عالمی معیاروں کے مطابق

دیکھنے کی جو آرزو ہے، اس کی تکمیل اسی طرح کے منصوبے سے ہوسکتی تھی۔

وہاب اشرفی کی ''تاریخ ادبیات عالم'' اردو میں اپنے نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کی پانچ ضخیم جلدیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ منصوبہ سات جلدوں میں مکمل ہوگا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اس بڑے کام کا بیڑا وہاب اشرفی نے اٹھایا۔ اس کی پہلی جلد میں مصری، اشوری، یونانی، چینی، عراقی، کیلٹی، ہسپانوی، لاطینی، سنسکرت، پالی اور فرانسیسی اور دوسری جلد میں جرمن، امریکی، اسکینڈ نیویائی، تامل، فارسی، عربی کے چھ سات ہزار سال کے ادبی سرمایے کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ دوسری جلد میں مصری، یونانی، لاطینی اور سنسکرت ادب کے ان ادوار کے احوال بھی درج ہیں، جن کا احاطہ پہلی جلد میں نہیں ہوسکتا تھا۔ تیسری جلد میں اطالوی اور روسی کے علاوہ ڈنمارک اور اسکاٹ لینڈ کے ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں قبل از مسیح کے بعض شاعر اور فنکار جائزے میں آنے سے رہ گئے تھے، لہٰذا اس کا ازالہ کرتے ہوئے تیسری جلد میں یونانی، فرانسیسی، ہسپانوی، کیلٹی اور سنسکرت ادبیات پر مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھی جلد اس لحاظ سے اور اہم ہے کہ اس میں سوئڈش، پرتگالی، ڈچ، پنجابی، مراٹھی اور بنگالی ادب کے اعلیٰ نمونوں پر پہلی بار تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ جرمن اور تامل ادب کے حوالے سے بھی نئی باتیں سامنے لائی گئی ہیں۔ تیسری اور چوتھی جلد میں اٹھارویں سے انیسویں صدی تک کے ادب کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں اور ان غیر ملکی زبانوں جن سے ہم مانوس ہیں مثلاً عربی اور فارسی، ان کے ادب کا احاطہ آئندہ جلد میں ہوگا۔ اردو کی تاریخ کے لئے ساتویں جلد مختص ہوگی۔

''تاریخ ادبیات عالم'' صرف معلومات کا خزانہ یا اطلاعات کی کھتونی نہیں۔ اس میں خود مصنف کا ذوق ادب سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے محض ادب کی تاریخ کے طور پر نہیں، بلکہ ادب میں جاری و ساری روح کی لطافتوں سے لطف و حظ حاصل کرنے کے لئے پڑھنا چاہئے۔ ممکن ہے اس قاموسی کتاب میں اس منصوبہ بندی کی کمی محسوس ہو جو اس نوع کے Encyclopaedic کام کا تقاضہ ہوتی ہے، لیکن وہاب اشرفی کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ ان کی انفرادی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کے کام کسی انجمن یا ادارے کی جانب سے مصنفین اور مولفین کی ایک جماعت کرتی ہے اور تجربات بتاتے ہیں کہ ہمارے یہاں اس میں بھی ناکامی ہوتی رہی ہے۔ دراصل ہم سب محنت طلب کام کرنے سے جی چراتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہاب اشرفی کے کام کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔ عالمی شعر و ادب کے مختلف ظواہر کو اور اس کی نیرنگیوں کو

اس دلکش پیرائے میں بیان کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ کتاب اس نوعیت کی تاریخ نہیں ہے کہ کون شاعر یا ادیب کب پیدا ہوا، کیسی زندگی جیا، کون کون سی کتابیں لکھیں، بلکہ وہاب اشرفی نے دنیا کے مختلف ادب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے الگ اور دور ہونے کے باوصف کن کن ممالک کے شعر و ادب کے کون کون سے گوشے اتصال اور یگانگت کے رشتے میں منسلک ہیں۔ ان میں کتنی مماثلتیں ہیں اور ان قربتوں میں دوریوں کے کتنے پہلو ہیں۔

دنیا کے کسی ایک علاقے کی ادبی تاریخ کو بھی پچاس، ساٹھ یا سو صفحات میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں، محال ہے۔ لیکن وہاب اشرفی نے پورے سمندر کو نہ سہی، سمندر کے ایک حصّے کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انسانی جذبات کی نوعیت ہر ملک میں یکساں ہے۔ محبت، نفرت، وفا، بے وفائی، ہمدردی، ظلم، صلح و جنگ، فتح و شکست، رنج و غم۔ یہ سارے موضوعات ادبی تخلیقی سرگرمیوں کے محرک رہے ہیں، لیکن ہر ملک کا لکھنے والا اپنی زمین کی بو باس سے بھی اپنے مشام ادب کو معطر رکھتا ہے۔ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ ہم اردو والوں کو دوسرے ممالک کے تجربے سے اور اس کے سود و زیاں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دوسروں کے ادب کی ہواؤں میں بھی سانس لیں۔ ہمیں اپنی اجتماعی اور اخلاقی سرحدوں کو وسعت دینی چاہئے، اپنے ادب کو انسانی ترکے کا حصّہ بنانے کے لئے جغرافیائی حد بندیوں سے اوپر اٹھنا چاہئے، میں سمجھتا ہوں وہاب اشرفی کی ''تاریخ ادبیات عالم'' کا مطالعہ بھی کئی طرح سے فیضان پہنچا سکتا ہے۔ یہ کتاب ان سوالوں تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے کہ مشرق اور مغرب کے ادب کا فرق کیا محض سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کا فرق ہے؟ یا کیا اس کا تعلق محض ادبی مذاق سے ہے؟ یا حقیقت تک رسائی کے لئے دونوں کے راستے الگ الگ ہیں؟

ہر ملک کی اپنی کچھ مخصوص اخلاقی اور تہذیبی قدریں ہوتی ہیں جو شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کسی ملک کی ادبیات کی تاریخ سے وہاں کے لوگوں کی فکر کے دھاروں، ان کے ادبی مذاق اور زندگی کی بابت ان کے رویّوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادب اور ادبی تاریخ کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھنے کا عمل ہمیں وہاب اشرفی کے یہاں نظر آتا ہے۔ ہر چند کہ جغرافیائی، نسلی اور طبعی اختلافات و تضادات نے دوریاں بھی پیدا کی ہیں، لیکن ان کے باوجود بہت سے معاملات میں انسان ایک ہی طرح سوچتا رہا ہے۔ بہت سی آفاقی سچائیاں ہیں جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' انہیں سچائیوں کی باریافت کی ایک مستحسن کوشش ہے۔

تسنیم حنفی

تاریخِ ادبیات عالم: ایک مطالعہ

اشتہار کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے مارٹر نے کہیں لکھا تھا کہ یہ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا آشوب ہے اور اس نے اچھے برے میں فرق کرنے کی صلاحیت انسانوں سے چھین لی ہے۔ یہ بات اس وقت یاد اس لیے آئی کہ خود اشتہاری کے اس عہد بے حجاب میں وہاب اشرفی نے علمی سرگرمی کے وقار کو ہر قیمت پر قائم رکھا ہے۔ پچھلے تقریباً پچیس برسوں سے وہ اپنے گیان دھیان اور تپسیا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ انہیں تلاش ہے تو صرف اپنے آپ کو پانے اور سمجھنے کی اور اس کا جو راستہ انہوں نے اپنایا ہے وہ ہے ماضی اور حال کے علمی و ادبی سرمائے کی، چھان بین اور تجزیہ و تفہیم کا۔ ہمارے زمانے میں بہ قول رشید حسن خاں کتابوں نے اینٹ پتھر کے زینوں کی شکل اختیار کر لی ہے جن سے گزر کر ''دانشمند'' لوگ ترقی اور کامرانی کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔ انہیں اصل غرض کامیابی اور ترقی سے ہوتی ہے کتابوں سے نہیں اس لیے وہ کتابیں لکھنے پڑھنے سے زیادہ کتاب سازی کے عمل سے سروکار رکھتے ہیں۔ علم و ادب کے دنیا میں آج کے جیسا مارا ماری پن شاید انسانی تہذیب کے کسی دور میں دیکھا نہیں گیا۔ وہاب اشرفی سے میری پہلی ملاقات، ملاقات کیا روشناسی کہیے، ۱۹۶۵ء میں ہوئی تھی۔ اگست کا مہینہ تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ملازمت کی امید انٹرویو کے لیے آنے والی بھیڑ میں ہمارے ساتھ وہاب اشرفی بھی تھے۔ ان پر نگاہ یوں ٹھہری کہ وہ نہ تو پریشان دکھائی دیے، یہ متجسس، کسی حد تک اپنے آپ میں گم، خاموش، اپنی بڑی بڑی حیران اور شفاف آنکھوں سے وہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ تعارف ہوا، دو چار رسمی باتیں، پھر ہم ایک دسرے کو بھول گئے، اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد وہاب اشرفی کی تحریریں سامنے آئیں تو اس بھیگی ہوئی دوپہر کا خیال بھی آیا۔ دوسری ملاقات برسوں بعد ہوئی۔ وہ جب بھی اور جہاں بھی ملے، ان کی خاموشی، متانت، گم شدگی اور کاروبار زندگی سے ایک سوچی سمجھی لاتعلقی کا بھرم اسی طرح برقرار رہا۔ ہمارے معاصرین میں گنتی کے چند لوگوں نے اس

خاموشی اور وقار کے ساتھ اور اس معیار کا علمی اور ادبی کام کیا ہے۔ وہاب اشرفی اپنے رویّوں کے اعتبار سے خاصے جدید آدمی ہیں مگر ان میں خو بو گئے وقتوں کے شرفاء کی ہے جو دنیا میں رہتے تو تھے مگر دنیا کے طلب گار نہیں ہوتے تھے۔

اصل میں خالص ادب کا تصوّر اور اس کا دائرہ، دونوں محدود ہوتے ہیں اور انسانی کائنات کے بہت سے مظاہر اور مناظر کا دروازہ ہم پر بند کر دیتے ہیں۔ وہ ایک چیز جسے ہم فراق کے لفظوں میں آوارگیٔ عشق کہتے ہیں اور جو کہیں آئے جائے بغیر بھی ہمیں گردوپیش کی دنیا کے پتے بتا دیتی ہے، صرف ان لوگوں کا شیوہ ہے جو دنیا کے کاروبار اور علم کے وقار کا فرق و امتیاز ہر حال میں قائم رکھتے ہیں۔ وہاب اشرفی کے یہاں شعر و ادب سے دل چسپی علم اور فکر کے بہت سے واسطوں کی پیدا کردہ ہے۔ چنانچہ ان کی علمی اور ادبی سرگرمی بھی ایک بہت بڑی منظم اور بسیط انسانی سرگرمی کا حصّہ ہے، مذہب، تصوّف، تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، منطق، سائنس اور سماجی علوم کے وضع کردہ کئی راستوں سے گزر کر وہ تخلیقی لفظ کی پر جلال، مہیب اور اسرار آمیز کائنات تک پہنچے ہیں۔ اسی لیے وہاب اشرفی کی تحریروں میں کہیں بھی اکہرے پن کا گزر نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سالک مقامات میں کھونے نہیں پایا اور اپنے مرکز سے اس کی نظر کبھی ہٹی نہیں۔ اسی لئے ایک طرف تو وہاب اشرفی خالص ادبی اقدار کی قسم کے کسی تصوّر سے مغلوب نہیں ہوئے، دوسری طرف فلسفہ اور فکر کی وسیع و عریض دنیاؤں کی سیر میں بھی انہیں ہمیشہ اپنی منزل کا خیال رہا۔ ہندستان کے نئے ادیبوں میں شمس الرحمٰن فاروقی کے بعد، قدیم و جدید علوم سے بیک وقت استفادے کی یہ دوسری سب سے روشن مثال ہے۔

وہاب اشرفی ایک نہایت جاذب اور حسّاس ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ مشرق و مغرب اور ماضی و حال سے یکساں شغف کے باوجود انہوں نے کسی ادبی نظریے کی اعانت قبول نہیں کی۔ ان کا شعور آزاد، ان کی بصیرت بے تعصب اور ان کی نظر جرأت آزما ہے۔ اسی لیے وہاب اشرفی کی تحریروں میں کہیں بھی کسی آسیب کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ فقرے بازی، تضحیک، طنز و تمسخر کے عناصر سے بھی اپنی تحریر کو بچائے رکھتے ہیں۔ فقرے بازی اور تمسخر سے لکھنے والے کو ایک فائدہ یہ تو پہنچتا ہے کہ اس کی تحریر صرف مزے کی خاطر بھی پڑھ لی جاتی ہے لیکن نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس شوق کے سیلاب میں اس کی اپنی بات بھی کہیں جمنے نہیں پاتی۔ وہاب اشرفی نے مباحثے اور مناظرے کے ماحول میں بھی اپنی سنجیدگی پر حرف نہیں آنے دیا اور اپنی بات کھونے نہیں دی۔ میرا خیال ہے کہ اسی رویّے کے باعث ہمارے زمانے کی حسیت

اور فکر کی تفہیم و ترویج میں ان کے مضامین اور کتابوں کا رول بہت مفید اور موثر رہا ہے۔ وہاب اشرفی دل جمعی اور نظر کی یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے لیے اس انداز فکر کا سب سے بڑا انعام ''تاریخ ادبیات عالم'' کی تالیف ہے۔

کتابوں کا یہ حیران کن اور عظیم سلسلہ ایک طویل خواب نامے کی تعبیر ہے۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' کے پہلی جلد کے ساتھ گذارش احوال کے تحت اپنے تعارفی نوٹ میں وہاب اشرفی نے لکھا تھا ''ایک ملک کا ادب دوسرے ملک سے مختلف ہوسکتا ہے بلکہ ہوتا بھی ہے لیکن متعیّنہ عہد کے حوالے سے مختلف قوموں اور ملکوں کے ادب عالیہ کا مطالعہ اور موازنہ ممکن بھی ہے اور مفید بھی۔۔۔ کسی ایک زباں کی تاریخ لکھنے کا عزم ہی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے، چہ جائے کہ ادبیات عالم کے احاطے کا خواب دیکھا جائے''۔ اس سلسلے کی یہ پانچویں کتاب ظاہر کرتی ہے کہ وہاب اشرفی کے خواب کا سرا ابھی ختم نہیں ہوا اور ذمے داری کے جس احساس کے ساتھ انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے بھانے کی سکت اور صلاحیت بھی ان میں باقی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مختلف ادبی روایتوں کا مطالعہ ایک سطح پر مختلف تہذیبوں کا مطالعہ ہوتا ہے۔ اور ہر قوم کی جمالیات، اس کے تخلیقی وجدان، بنیادی رویّے اور شعور کی جہت کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کے تہذیبی تشخص کو مرتب کرنے کا سب سے نمایاں وسیلہ بھی دراصل اس کی ادبی روایت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں ایک ساتھ کئی تہذیبی اور فکری میلانات کی تشکیل ہوتی ہے۔ ان میں ایسے عناصر بھی رونما ہوتے ہیں جن سے ان کے تنوّع اور ان کے باہمی فرق و امتیاز کی نشان دہی ہوتی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے عناصر بھی سامنے آتے ہیں جن سے ان کے مابین ربط اور تعلق کا پتا چلتا ہے۔ غرض کہ ادبیات عالم کے ایک ساتھ بہت سے رنگ ہیں اور بہت سے زاویے۔ بہ ظاہر ان میں ایک دوسرے سے دوری دکھائی دیتی ہے، لیکن اقوام عالم کی آپسی قرابت داریوں کا سب سے واضح نقش بھی ادب ہے۔ وہاب اشرفی نے انسانی حقیقت کے ساتھ کے ایک پیچیدہ مظہر کو اس کی کلیت اور اس کی رنگا رنگی، دونوں کے سیاق میں دیکھا ہے۔ ان کے اس عمل کی کثیرالجہتی پر نظر ڈالی جائے تو فرانسیسی انقلاب سے پہلے کے ان قاموسیوں کا خیال آتا ہے جس کی علمی سرگرمی تاریخ کی ایک دوررس اور ہمہ گیر اجتماعی واردات کا پیش خیمہ بنی۔

ہم ایک بدلی ہوئی دنیا اور دور کے باسی ہیں، تضادات سے بھری ہوئی دنیا اور نظری اختلافات میں گھرے ہوئے اس دور کے ساتھ بالآخر ہم کہاں پہنچ کر دم لیں گے، کسی کو پتا نہیں۔

البتہ اتنا طے ہے کہ وہاب اشرفی کی یہ کوشش سنجیدہ تحریری لفظ کے کھوتے ہوئے اعتبار کے عہد میں صرف ایک عشق کا سودا ہے۔ غیر دلچسپ تحریریں پڑھنے والوں کا حلقہ سمٹ رہا ہے اور خاص طور پر اردو معاشرے کا حال تو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بھی ابتر دکھائی دیتا ہے۔ جس زبان کے معروف اور متین لکھنے والوں کی کتابیں بھی چار سو پانچ سو کے حساب سے چھپتی ہوں اور ادب یا ادبی تصورات کے نام پر خود اشتہاری اور دنیا ساری کا بازار گرم ہو'' تاریخ ادبیات عالم'' کے جیسے کسی منصوبے میں ہاتھ ڈالنا دانش مندی کی علامت تو نہیں ہے۔ وہاب اشرفی نے اس تشویش ناک ماحول میں اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا ہے ان کی آزمائشیں اور دقتیں ظاہر ہیں۔ لیکن اس سلسلے کی پچھلی چار کتابوں میں انہوں نے ادراک و افہام کی ایک سطح برقرار رکھی ہے جو عام پڑھنے والوں کے مطالبات کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ اردو میں عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن ادب کے بارے میں تو کتابیں مل جاتی ہیں۔ کچھ دنوں پہلے محمد سلیم الرحمٰن نے یونانی ادب پر ایک وقیع دستاویزی نوعیت کی کتاب شائع کی تھی۔ لیکن ابھی تو ہندی یا اکا دکا علاقائی زبانوں کو چھوڑ کر ہمارے یہاں خود اپنے ملک کی ادبی روایتوں پر کام ہونا باقی ہے۔ ایسی صورت میں وہاب اشرفی کے اس قاموسی کارنامے کا کماحقہ خیرمقدم کیا جانا چاہئے۔

وہاب اشرفی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور روایت کے تمام سلسلوں پر گرفت رکھتے ہیں۔ کلاسیکی ادبیات سے ان کا شغف بہت گہرا ہے۔ اردو کی کلاسیکی روایت اور ادب کی عالمی روایت تک رسائی کے لیے، دو زبانیں جو سب سے کارآمد وسیلوں کی حیثیت رکھتی ہیں، یعنی کہ فارسی اور انگریزی۔ ان دونوں زبانوں کا مطالعہ انہوں نے دل جمعی کے ساتھ کیا ہے۔ اسی لیے اپنے مآخذ کی تلاش اور دریافت کے معاملے میں وہ محتاط رہے ہیں۔ اور اردو میں '' تاریخ ادبیات عالم'' کے اس سلسلے نے ایک معتبر حوالے کی حیثیت جو اختیار کی ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ وہاب اشرفی نے مشرق و مغرب کی ادبی روایات کے صرف ایسے مصادر سے رجوع کیا ہے جنہیں استناد کا درجہ حاصل ہے۔

اس مرحلے میں سب سے بڑی شرط یہ آتی ہے کہ لکھنے والے کا ذہن پہلے سے قائم کردہ مفروضوں اور تعصبات سے یکسر آزاد ہو۔ اس پر بے جا حجابات اور امتناعات کا بوجھ نہ ہو۔ اس کے وجدان میں اتنی لچک ہو کہ وہ قدیم و جدید، مغربی اور مشرقی، مانوس اور نامانوس اقدار اور عناصر کو ایک سی ذہنی آمادگی کے ساتھ قبول کر سکے۔ اس کی بصیرتوں کو دلائل اور حقائق کی تائید حاصل

ہو۔ اور وہ اپنی جذباتی ترجیحات سے اوپر اٹھ کر مختلف روایتوں کی چھان بین کر سکے۔ ہمارے زمانے میں شعور کو ڈی کولونائز کرنے کی جستجو نے ایک طرح کے قومی نصب العین کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس معاملے میں ایک عجیب و غریب جذباتیت اور فکری انتہاپسندی نے سر اٹھایا ہے۔ اس رویّے کی کرشمہ سازی نے جنوں و خرد کے نام بدل کر رکھ دیے ہیں۔ ہندی اور مراٹھی ادیبوں کے ایک حلقے میں اس رویّے کے باعث مراجعت اور احیاء پرستی کا ایک خطرناک میلان پیدا ہوا ہے۔ کچھ اردو والوں میں بھی اپنی اقدار کی بحالی اور کولونیل فکر سے رہائی کے نام پر کچھ تماشے سامنے آئے ہیں۔ دوسری طرف اور دوسری انتہا پر وہ اردو ''ادیب'' ہیں جو ایک بے مابعد جدید منشور کا دعوا کرتے ہیں اور اپنے آپ سے دست بردار ہونے میں بھی جنھیں تامل نہیں ہوتا۔ وہاب اشرفی کا وصف یہ ہے کہ اپنی اس صبر آزما اور طویل سرگرمی کے دوران ان کا ذہن کہیں بھی اس طرح کے جذباتی اور ضمنی مباحث میں نہیں الجھتا۔ وہ اپنے مطالعے یا ادراک پر کوئی حد قائم نہیں کرتے۔ اپنی ترجیحات کو سامنے نہیں لاتے۔ ہر طرح کے زعم اور تعصب کو بالائے طاق رکھ کر اجنبی اور نامانوس دنیاؤں میں قدم رکھتے ہیں۔ صرف حقیقت حال تک رسائی کو اپنا مقصود جانتے ہیں۔ گویا کہ حوالے کی ایک اچھی کتاب میں مصنّف کا جو متناسب اور متوازن انداز نظر ہونا چاہئے، صرف اس سے کام لیتے ہیں۔ اسی انداز نظر نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کو آزاد بصیرت اور جاذب شعور کے ایک وسیع سفرنامے کی حیثیت دے دی ہے۔

ایک آخری بات مجھے وہاب اشرفی کے پیرایۂ بیاں کے بارے میں کہنی ہے۔ اس غیر معمولی طور پر پھیلے ہوئے علمی کارنامے میں، ان کا اپنا اسلوب علم نمائی اور تصنّع کی خرابیوں سے یکسر پاک ہے۔ ہر طرح کے پور سے مکمل طور پر عاری اسلوب نے اس کتاب کو ادب کے عام قاری کی دسترس سے دور نہیں ہونے دیا۔ جارگن اور اصطلاحات کے جا و بے جا استعمال کے شوق نے اردو کی جدید بلکہ جدید تر تنقید کا جو حال کر دیا ہے، اس سے عام قاری کے لیے ایک عجیب و غریب خوف کی نفسیات سامنے آئی ہے۔ وہ علمی کتابوں کو ہاتھ لگاتے ڈرتا ہے۔ دریدا اور لاکاں انگریزی کی مدد سے سمجھ لیے جاتے ہیں۔ اردو کا قالب اختیار کرتے ہی علاقہ ممنوعہ کے مکیں بن جاتے ہیں۔ آرول نے کہا تھا کہ گنجلک اور تاتر سے خالی نثر اسی وقت لکھی جاتی ہے جب لکھنے والا یا تو اپنے موضوع پر ماہرانہ گرفت سے محروم ہو یا پھر جھوٹ بول رہا ہو اور اس کی کوشش یہ ہو کہ اس کا قاری بات کے اصل مطلب تک پہنچنے نہ پائے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہاب اشرفی ایسی کسی مصلحت یا مجبوری کے پابند نہیں ہیں۔ سیدھے سہج سبھاؤ کے ساتھ چیزوں کو سمجھنا چاہتے ہیں

اور آپنے پڑھنے والے کو مرعوب کرے یا جکمہ دینے کے پھیر میں نہیں پڑتے۔

ہر کتاب کی طرح اس کتاب کی بھی اپنی کچھ حدود ہیں۔ لیکن یہ معمولی بات نہیں کہ ''تاریخ ادبیات عالم'' تن تنہا ایک شخص کا کارنامہ ہے، ایسا کارنامہ جس کی وقعت اور قدر و قیمت کا اعتراف لوگ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ کتاب دوسری ہندوستانی زبانوں، کم سے کم ہندی میں بھی منتقل کی جاسکتی۔ اردو کے اعتبار اور وقار میں اس سے اضافہ ہوگا۔

(''تاریخ ادبیات عالم'' کے جلد اوّل و دوم کا ہندی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ ''وشو ساہتیہ کا اتیہاس'' بھاگ ایک اور دو کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مرتب)

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

”تاریخ ادبیات عالم“ - ایک اہم کتاب

ہر چند کہ آج سائنس کی ایجادات نے دنیا کی طنابیں کھینچ دی ہیں اور تمام ملک گھر آنگن ہو گئے ہیں، لیکن قوموں، نسلوں، زبانوں، تہذیبوں اور فکری طور طریقوں کے فرق و امتیاز باقی ہیں۔ آفاقیت کا تصور کام کر رہا ہے، لیکن کہیں کہیں ایسی قوتیں بھی کارفرما ہیں جو ان امتیازات کو زیادہ گہرا کر کے انسانیت کو پارہ پارہ کر دینا چاہتی ہیں۔ یہ گویا اس دور کی پس روی ہو گی جب محدود وسائل کی بناء پر انسان چھوٹے چھوٹے علاقوں میں محدود تھا۔ علاقائی وسائل ہی اس کا سرمایہ تھے۔ آمد و رفت کی محدودیت کے بارے میں وہ اپنے علاقے کے علاوہ دوسروں سے ذرا کم ہی واقف ہوتا تھا۔ اس کی اپنے علاقے کی زبان تھی، وہیں پیدا ہونے والے رسم و رواج تھے۔ حالات سے پیدا ہونے والے عقائد تھے۔ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے اپنے طریقے تھے لیکن آج جب ہم معلوم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان علاقائی خانوں میں بٹے ہوئے انسانوں میں کچھ مشترک اقدار بھی نظر آتی ہیں۔ ان کی جسمانی ضرورتیں یکساں ہیں۔ فطری جذبات، محبت، ہمدردی، ایثار اور ساتھ ہی غصہ، نفرت، حسد سب جگہ موجود ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہیں ان کے ساتھ حریفانہ دست و گریبان ہوتا ہے اور کہیں حلیفانہ مفاہمت کرتا ہے، کبھی قدرتی قوتوں سے مغلوب ہو جاتا ہے کبھی ان سے پنجہ آزمائی کرتا ہے۔ اشیائے کائنات میں غور و فکر کرتا ہے، ان کی توجیہات کرتا ہے اور اسی سب سے پیدا ہوتی ہے اس کی دانش، اس کی فہم اور اس کی بصیرت اور اس کا سب سے سچا اور سب سے معتبر اظہار ہوا ہے علاقائی ادب میں۔ ان گیتوں میں جو لوگوں نے مل کر گائے، ان کہانیوں میں جو انہوں نے اپنی فرصت کے اوقات میں ایک دوسرے کو سنائیں اور پند آموزی کے لئے اپنی آنے والی نسل کو منتقل کیں۔

ادبیات عالم پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دانش اور فہم و بصیرت میں کتنی مشترک

اقدار پنہاں ہیں۔ نسلی، علاقائی اور طبعی اختلافات کے باوجود بہت سے امور میں فکر انسانی یکسانیت کی حامل رہی ہے۔ اس دانش کے لین دین میں کوئی تعصب نہیں برتا گیا۔ قوموں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے، چراغ سے چراغ برابر جلتا رہا ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے جو ہمیشہ بڑے بڑے اور اہم کارنامے انجام دیتے رہے ہیں۔ اس عالم کی سیر کرانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے انسان کے چھ سات ہزار سال کے ادبی سرمایہ کی تاریخ مرتب کی ہے۔ اس میں چار پانچ ہزار سال زمانہ قبل مسیح کے ہیں۔ مصر، اسوریا، بابل کلدان جہاں اب تک کے علم کے مطابق انسانی تمدن کی ابتدائی نشو و نما ہوئی۔ وہیں سے ادبیات سے اس تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدائی دو جلدیں صرف قبل مسیح ادبیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اشرفی صاحب نے قدیم ترین مآخذ کی تحقیق کی ہے، ریزہ ریزہ کر کے اپنا مواد جمع کیا ہے اور پھر اپنی ناقدانہ بصیرت کے ساتھ اس کو مرتب کیا ہے، اس کا تعارف کرایا ہے، اس کی تحسین کی ہے۔ اگر ان تحریروں میں ایک طرف ان کی فہم و بصیرت نظر آتی ہے تو دوسری طرف ان کے قلم کی پختہ کاری نمایاں ہے۔ تاریخ کے ساتھ خشک بیانی کا تصور وابستہ ہے۔ لیکن یہاں ان ادبیات کی دلکشی کے ساتھ ساتھ مصنف کے قلم کی شگفتگی نے اس کو وہ رنگ و آہنگ عطا کیا ہے جو اس کی دلچسپی کا ضامن ہے

اردو میں انگریزی، فرانسیسی، روسی، عربی، فارسی، ہندی وغیرہ کی ادبی تاریخیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن یہ اپنی نوع کی پہلی تصنیف ہے، جس میں دنیا کی تمام اہم زبانوں اور علاقوں کے ادب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس سے اردو کا دامن اس سرمایہ سے پُر ہوگا جس سے ابھی دنیا کی بڑی زبانیں خالی ہیں۔ اس سے ایک آفاقی تصور پیدا ہوگا، اس سے انسانیت کے فروغ میں مدد ملے گی، اور ایک عالمی نقطۂ نظر پیدا ہوگا۔

امید ہے کہ یہ کتاب اپنی گوناگوں افادیت اور شگفتگی کے باعث علمی حلقوں میں بہ استحسان دیکھی جائے گی۔

علی احمد فاطمی

"مابعد جدیدیت۔ مضمرات و ممکنات": ایک محاسبہ

پروفیسر وہاب اشرفی اردو تنقید و ادب کے محترم و معتبر نقادوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا نام اور کام دونوں پایۂ اعتبار کو پہنچ چکے ہیں۔ جہاں انہوں نے قطب مشتری اور شاد عظیم آبادی جیسے موضوعات پر کام کر کے مشرقی علوم اور کلاسیکی ادب کی گرفت اور سحر کے ثبوت فراہم کیے ہیں وہیں تاریخ ادبیات عالم کو کئی جلدوں میں سمیٹ کر اپنی مغربی، عالمی فکر و نظر کے نقوش بھی ثبت کیے ہیں اور جو بھی بڑا ادیب و شاعر نہ ہوگا دنیا کے علوم و فنون و رجحانات سے واقف ہوگا وہ نہ صرف دونوں کے رشتوں کی فکری و تہذیبی ہم آہنگی تلاش کرے گا بلکہ اور آگے بڑھ کر نئے تصورات کو رائج کرنے، انہیں عام کرنے کی کوشش بھی کرے گا اور پس پردہ صرف رہتا ہی نہیں بلکہ رجحان ساز کو بھی تاریخ کے ایک نئے موڑ پر لا کر چھوڑنے کی کوشش کرے گا۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ اختلاف و اتفاق اور رد و قبول بھی اسی فطری عمل کا حصہ ہیں جس سے وہاب اشرفی بھی بار بار گذرے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہاب اشرفی کا شمار ترقی پسندوں میں ہوا کرتا تھا اس کے بعد جدید رجحان کے طرفداروں میں بھی وہ شمار کیے گئے اور اب مابعد جدید افکار و خیالات کے علمبرداروں کی پہلی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ آخری رجحان کی دعویداری پچھلے رجحانات کے مقابلے کچھ زیادہ ہی ہے، مابعد جدیدیت کا رنگ کچھ زیادہ ہی نمایاں، سنجیدہ اور گہرا ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ پروفیسر موصوف کی ذہنی وسعت، ارتکاز اور بلندیٔ فکر و نظر کا اہم عمل ہے جہاں فکر و خیال کے کئی دھارے، زندگی کے مختلف تجربے و مشاہدے، مشرقی و مغربی ادب کے مطالعے نقطۂ عروج پر سمٹ آئے ہیں۔ اسی نقطہ کا ارتقا و ارتفاع ہے ان کی تازہ تصنیف "مابعد جدیدیت۔ مضمرات و ممکنات" جس کی ابتدا میں وہاب اشرفی کا اظہار ...

''مابعد جدیدیت ایک ادبی اصطلاح کے طور پر نہ صرف رائج ہو چکی ہے بلکہ اس کے عوامل، حلقہ ا ثر اور محتویات پر اچھی خاصی روشنی بھی ڈالی جا چکی ہے تو پھر اس کتاب کی ضرورت کیوں؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب بھی وہ یوں دیتے ہیں ۔

''کوئی بھی موضوع کسی بھی متعلقہ کتاب یا مقالے سے ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتا، گنجائش باقی رہتی ہے۔ بعض نکات تشریح طلب اور وضاحت طلب رہ جاتے ہیں، بعض کے بارے میں نئی روشنی اور نئے امکانات سامنے آجاتے ہیں نئی تھیوری بہت سے امکانات کی خبر دیتی ہے۔ اس کے مُضمرات بڑے وسیع ہیں۔''

اس باب کے خاتمہ پر انہوں نے ایک معقول بات کہہ کر مضمرات کے مباحث کے لئے کچھ حدیں قائم کر دیں۔ کہتے ہیں ۔

''ہر زباں کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور وہ اپنی ثقافت سے تعمیر ہوتا ہے چنانچہ مغربی مابعد جدیدیت اور اردو مابعد جدیدیت میں حدِّ فاصل قائم کرنی پڑے گی ——— اور یہ ہو بھی رہا ہے۔''

اپنے اس حرف آغاز کے بعد انہوں نے اپنی اس گراں قدر تصنیف کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصّہ میں مابعد جدیدیت کے تشکیلی پہلو سے لے کر مباحث کے نتائج تک کی بحث سمیٹی گئی ہے۔ دوسرے حصّہ میں اردو مابعد جدیدیت پر چند نکات پیش کرنے کے بعد شاعری، فکشن، تنقید وغیرہ میں اس کے عناصر تلاش کر کے آخری بات کہی ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کا خیال ہے کہ مابعد جدیدیت کا تعلق کسی نہ کسی طرح ساختیات اور پس ساختیات سے رہا ہے اس سلسلے میں وہ مفصّل گفتگو اپنی کتاب ''حرف حرف آشنا'' میں کر چکے ہیں تاہم اس باب میں وہ اپنی گفتگو ساسئیر (SAUSSURE) سے کرتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ معاشیات کے سلسلے میں مارکس اور نفسیات کے سلسلے میں فرائڈ پر بہت باتیں ہو چکی ہیں اور ساسئیر سے اردو دانشوران کی آگہی بہت کم ہے۔ ان کی اس بات سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں لسانی ساخت اور اس سے وابستہ مکمل لسانی و ثقافتی نظام پر بہت کم باتیں کی گئی ہیں لیکن یہ بھی سوچتے چلنا چاہئے کہ ساسیر کا طریق فکر خیالات و افکار کی دُنیا میں داخل ہونے کا ایک راستہ تو ہو سکتا ہے کُلیّہ نہیں اور شاید مصنّف نے کُلیّہ کہا بھی نہیں اس لئے کہ اس مقام پر ان کا عمل فکری و نظریاتی کم تعارفی زیادہ ہے۔ پھر بھی جب یہ جملے ہمارے سامنے آتے ہیں ۔

''شاعری یا ادب میں تجربہ کوئی چیز نہیں، ہر تجربہ پہلے ہی سے ایک مخصوص نظام میں موجود ہے۔ زبان ایک کل ہے اس کے اجزاء اکائیاں ہیں۔ یہ اکائیاں اپنے آپ میں خود کفیل ہیں۔''

ادب کو اگر شخصیت سے جوڑا جائے تو اس کا رشتہ سوانح یا نفسیات سے جُڑ جاتا ہے اگر اسے سماج کی تصویر کہا جائے تو پھر تاریخ، سیاست اور سماجیات کی کھتونی ہیئت پرست اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہیئت پرستی نہ تو جمالیات ہے اور نہ ہی کوئی طریقِ کار بلکہ یہ ادب کا سائنس ہے جس سے ادبی مواد کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ادب میں زبان و بیان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ شاعری ہو یا فکشن سب الفاظ کے ذریعہ ہی ظاہر ہوتے ہیں ان کا اپنا محض لسانی ہی نہیں ثقافتی نظام بھی ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ ان تمام صورتوں کی تاریخ، سماجیات، جمالیات وغیرہ سے کوئی لینا دینا نہیں بعید از عقل ہے۔ ساسئیر زبان کی سائنس، اس کے حقائق، اس کے درست۔ اس کے تفریقی و اختلافی نیز اختلاعی نظام پر یقین کرے اور پیش کرے یہ ایک عمدہ کام ہو سکتا ہے اور تلاش و تحقیق۔ ابہام و تفہیم کا ایک کارآمد جدید طریقۂ کار لیکن لسانی و ساختیاتی نظام صرف ہیئت پرستی تک محدود رہے اور دوسرے افکار و خیالات سے رشتے کو محدود کر دے تو پھر کس طرح بامعنی اور بامقصد نظام رہ جائے گا۔ غور طلب پہلو یہ ہے بقول مصنف یا بحوالہ مصنف۔ ''ادیب تو کچھ بنا ہی نہیں سکتا وہ بے سائے نظام یا ساخت میں کام کرتا ہے۔'' ان جملوں میں ادیب یعنی حضرت انسان کے تئیں محدودیت و مشروطیت کا اظہار جھلکتا ہے جبکہ ہمارے ادیب و دانشور شاعروں کی خلاقی و دراکی اور لامحدود پرواز کے اعتبار سے آسمان سے تارے توڑنے میں مصروف ہیں اور بقول اقبال۔ ''عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں''۔ بہر حال ان افکار میں ابہام تو ہے ہی اور یہ ابہام اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب ادب کُلّی طور پر لسانی حوالوں سے ادیب کی موت کا اعلان کر دیتا ہے۔ رولاں بارتھ نے تو باقاعدہ ''The Death of Author'' جیسا مضمون ہی لکھ دیا جس میں وہ صاف کہتا ہے

''تحریر ہر آواز کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ تاسیس یعنی Origin کے ہر نقطے کو تباہ کر دیتی ہے۔ تحریر وہ غیر جانب دار، مخلوط اور غیر منقسم جائے پناہ ہے جہاں ہمارا موضوع قیام پذیر ہوتا ہے وہ ایک نفی کی صورت ہے جہاں لکھنے والوں کی شخصیت معدوم ہو جاتی ہے۔''

روایت تو یہ ہے کہ بالآخر تحریر ہی زندہ رہتی ہے اور اس کے ذریعہ تحریر خلق کرنے والا زندہ رہتا ہے۔ دنیا کے عظیم شاعر، فلسفی، فنکار اپنی تحریروں سے ہی زندہ ہیں، یہ الگ بات ہے کہ تخلیق۔تخلیق کار سے غیر متعلق (Detached) رہے تو بہتر ہے۔ تخلیق کار خود بڑی تخلیق کو جنم دیتے وقت اپنے آپ سے بے نیاز اور بے تعلق ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا فطری اور لا شعوری عمل ہے کہ اسے باضابطہ کسی فلسفہ کا روپ دے پانا اور ادیب کی موت کا اعلان کر دینا کسی بڑی سائنسی فکر کا جواز نہیں بنتی بلکہ ایک مخصوص طے شدہ فکر ومنصوبہ کا اعلان کرتی ہے حالانکہ یہ فکر یہ بھی کہتی ہے کہ ادب کے پیکر کو عوامی کلچر میں تلاش کرنا چاہئے۔

"The Text is a issue of quotations drawn from the in numbarable Centres of Culture "

——Ronald Berth

مصنف نے دوسرے باب کے ابتدائی صفحات میں سائسیر، جوناتھن کلر، جولیا کرسٹیوا، ژ یک دریدا وغیرہ کے افکار ونظریات کے حوالے سے ساختیات وپس ساختیات پر بحث کی ہے۔ دریدا سب سے زیادہ ان امور پر بحث کرتا ہے اور یہ بھی خیال ہے کہ وہ ردِّ تشکیل (Deconstruction) کی بنیاد رکھنے والا ہے۔ دریدا کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ متن کا مفہوم ہمیشہ غیر متعین ہوتا ہے اس کے بارے میں کبھی کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی مارکسی یہ سمجھتے ہیں کہ افراد سماجی زندگی اور سماجی نظام کا ایک حصہ ہیں ان سے الگ کچھ بھی نہیں، ادب کے معنیاتی نظام کو اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ دریدا کا نظریہ ہے کہ انفرادی عمل اور مباحث Signifying سسٹم سے علیحدہ کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن ان کا اصرار ہے کہ یہ سسٹم لاوقتی (Timeless) ہے اور خود کار بھی جبکہ مارکسی انہیں تاریخ کے حوالے سے دیکھا جاتے ہیں جن کا وجود تغیرات پر ہوتا ہے اور جس میں تضادات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وہ نو مارکسیت اور نئے مارکسی نقادوں کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس درمیان وہ باختن اسکول کا بھی ذکر کرتے ہیں جو صاف کہتا ہے کہ زبان کو تجریدی مباحث کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر زبان سماجی ساختہ (Socially Constructed) نشانوں کا نظام ہے تو یہ بذات خود حقیقت کا زوال ہے۔ اس ضمن میں وہ اہاب حسن، لیوتار وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ

فرانس کے مفکّر مائیکل فوکو (Michel Foucoult) کی تین کتابوں کا ذکر اور (Madness and civilization) کا ذکر بطور خاص کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ فوکو کا خیال ہے کہ ادب بہرطور ایک منظم سماجی ضابطوں کی پیداوار ہوتا ہے جس کی طرف توجہ ہونی چاہئے لہٰذا ادیب کی اہمیت اس لحاظ سے ہوتی ہے کہ اس نے سماجی صورتوں پر کیسی نظر رکھی ہے کہ اس کے متوں اُس کی انفرادیت کو اُجاگر کر سکیں ۔موضوع کو یکسر چھوڑ نا نہیں ہے بلکہ از سرِ نو تاویل کرنا ہے یہاں فوکو، دریدا یا دریدا فوکو کے قریب آجاتا ہے۔اس کے بعد مصنّف نے لاکان (Lacan) لوئی آلتھوسے وغیرہ کا تعارف پیش کیا ہے۔آلتھوسے سے کلاسیکی مارکسیت اور حدیدیت کے کمٹ منٹ سے بہت حد تک عبارت ہے اور اس کا خیال ہے اور شاید مصنّف کا بھی کہ نئی مارکسیت مابعد حدیدردیئے سے ہی جلا پاسکتی ہے۔آلتھوسے پہلی بار Humanism اور Structlrism کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح وہ ٹیری ایگلٹن کی کتاب The illusion of post Modernism اور Criticism and Ideology پر گفتگو کر کے بحث کو نو آبادیات اور پس نو آبادیات کی طرف موڑ دیتے ہیں اور گفتگو ایڈورڈ سعید تک پہنچتی ہے۔ایڈورڈ سعید کے تعلق سے مصنّف نے سیکولر تنقید کی اصطلاح استعمال کی ہے لیکن اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔

اس حصہ کا سب سے اہم مواد تاریخیت اور نو تاریخیت کے حوالے سے سامنے آتا ہے لیکن یہاں بھی گفتگو تعارفی نوعیت کی زیادہ ہے تاہم ادب اور تاریخ کے رشتوں پر کارآمد گفتگو سامنے آتی ہے۔تاریخ کا علم رشتوں اور رابطوں کا علم رہا ہے اس کا مقصد ثقافتی رابطے کو بھی واضح کرنا ہے یہ سب اپنی جگہ دُرست لیکن تاریخ نگار کی آنکھ پر بہرحال ایک قسم کی عینک چڑھ جاتی ہے جس سے واقعہ نگاری میں توجیہات کی صورت اُبھرتی ہے نہ ہی کثرت تعبیر کی۔یہ یک طرفہ تاریخ ہوتی ہے البتہ نئی تاریخیت- تاریخ کو سماجی حوالوں وسروکاروں سے دیکھا چاہتی ہے اس کی تشکیل میں ثقافتی تناظر نا گزیر ہے اور یہ ایسے عہد کی طاقت اور انتظامیہ سے کس قدر آزاد ہے۔ فوکو کا خیال ہے کہ ان کی تاریخ نویسی ثقافت کے مختلف رنگ پر زور نہیں دیتی بلکہ ایک طرح کی متعینہ کلچر کی نشاندہی کرتی ہے۔حقیقت دور ہوتی جاتی ہے چونکہ ثقافت بہت مرحلوں سے دوچار رہتی ہے اس لئے ان مرحلوں میں تضادات ہوتے ہیں جو کسی بھی متن کو متعیّن یا stable نہیں رہنے دیتے۔طاقت اور حکمرانی کے زعم میں تاریخ ایک ماطن تصوّرئیت کرتی ہے۔نئی تاریخیت کسی بھی تاریخی مرحلہ میں اتحاد سے برسر پیکار نظر آتی ہے۔نئی تاریخیت میں اس بات کا احساس دلایا

جاتا ہے کہ متن ڈائنامک ہوتا ہے جس میں کثرت سے مختلف عناصر داخل ہوتے رہتے ہیں ظاہر ہے ایسے میں Unstable ہونا ہی چاہئے۔ نئی تاریخیت ثقافت پر پہرہ داری کی تکذیب کرتی ہے۔ تاریخ قوتوں کی نمود کی تشکلوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور انسانوں پر اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں اس کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ نئی تاریخیت ان کی آنکھیں کھولنے پر کمربستہ ہے اور اس امر پر زور دیتی ہے کہ اس وقت کے سماجی رشتے کیا تھے ان کی شناخت کی جائے۔ ایسے میں مصنف کا خیال ہے کہ آج کے عہد میں پرانے تاریخی متون کی اہمیت زیادہ نہیں رہ جاتی لہٰذا پرانے متن کے تعلق سے رد تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ اس عمل میں وہ تمام تاریخی کوتاہیاں اُبھر آئیں جو معنوی اتحاد کے نام پر صفحات میں بکھیر دی گئی ہیں۔ جس طرح ادب کے متن کا جائزہ لیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح تاریخ کے متن کا۔ دونوں کے متن دراصل سماجی و ثقافتی کوائف ہیں۔ نئی تاریخیت میں سماج اور ثقافت کو منہا کر کے کوئی بات نہیں بن سکتی۔ مصنف کا بیان اگرچہ تعارفی و تاثراتی زیادہ ہے پھر بھی وہ اتنی صفائی اور وضاحت کے ساتھ اپنی باتیں کرتے چلے جاتے ہیں کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ان تمام مفکرین و فلسفیوں کو نہ صرف سنجیدگی سے پڑھا ہے، ان کے نازک مفاہیم کو انگیز کیا ہے، قربتوں اور فاصلوں کو بھی پیش کیا ہے اور اچھی بات یہ ہے کہ کہیں بھی اپنی رائے نہیں تھوپی ہے البتہ مباحث کے نتائج نکالتے ہوئے وہ ضرور لکھتے ہیں ۔

> ''عام نقطۂ نظر پر بڑا اعتبار کیا جا رہا ہے لیکن یہ سچائیاں ہمیشہ ماری جا رہی ہیں مرکزی حقیقتوں کی طرفداری نے چھوٹی چھوٹی سچائیوں کا گلا گھونٹنے ہی میں عافیت سمجھ رکھی تھی۔ ایسے میں چھوٹی چھوٹی سچائیاں جو قصبوں، دیہاتوں، علاقوں، کونوں اور گوشوں میں پرورش پاتی رہی ہیں انہیں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور Universal سچائی کے نام پر ان سے روگردانی کی جاتی رہی ہے۔ مابعد جدیدیت اس پر زور دیتی ہے کہ سچائی Universal نہیں ہوتی۔ آفاقی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ سچائیوں کا تعلق بھی مخصوص ثقافتوں کے حوالے سے ہی ممکن ہے اور ثقافت ہرگز آفاقی اور ہمہ گیر نہیں ہوتی۔''
>
> (ص ۵۵-۱۵۴)

ادب کے تعلق سے بھی وہ کہتے ہیں ۔

''ادبی مباحث میں ایک بہت اہم پہلو ادبی متن کو ثقافتی متن سے
الگ کرنا تھا مابعد جدیدیت ایسی تفریق کو لایعنی بتاتی ہے اس لئے
کہ ہر متن اپنی ثقافت کو چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور ایک متن میں کئی
متون داخل رہتے ہیں۔اب بین المتونیت کی تفہیم کوئی دشوار گذار
امر نہیں ہے۔'' (ص ۱۵۷)

ان تحریروں میں پوشیدہ معنی جدیدیت کا حوالہ تو ہوسکتا ہے، ترقی پسند فکر کا نہیں اس لئے کہ ترقی پسند فکر نے کبھی بھی سماجی وثقافتی پس منظر کے تغیرات ہی نہیں کی بلکہ اسی پر سب سے زیادہ زور دیا اور اسی لئے اعتراض اور مذاق کا نشانہ بھی بنی۔آج وہی بات مابعد جدیدیت کے حوالے سے کہی جارہی ہے۔لیکن اسے محض دُہرائے جانے کا عمل بھی نہیں کہا جا سکتا مابعد جدیدیت کی ثقافت ایسے فکری پس منظر میں ساختیات کا عمل رکھتی ہے جس میں متن اور لسان کا اہم رول ہوتا ہے ترقی پسند فکر سماجیات اور سیاسیات کے حوالے سے تہذیب وثقافت کے در کھولتی رہی ہے جس کی وجہ سے اس کا عمل خارجی زیادہ ہوتا رہا ہے جبکہ مابعد جدیدیت کا باطنیت اور اندرونی ساخت کا عمل زیادہ دکھائی دیتا ہے۔بہرحال یہ سب اتنا آسان بھی نہیں ہے۔جتنا کہ دکھائی دیتا ہے۔یہ ایک نازک اور پیچیدہ صورت ہے جسے خلوص، سنجیدگی اور گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ایک مقام پر مصنف بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ۔

''ان مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مابعدجدیدیت ایک
Complex صورت ہے جس نے روشن خیالی، آزادی، جنس بلکہ
زندگی کے بیشتر گوشوں کو نئے اور متنوع ڈسکورس سے ہمکنار کیا ہے۔''

لیکن ایک خیال اب بھی قائم ہے کہ طریقۂ کار یا مرحلے تک پہنچنے کا راستہ تو الگ ہوسکتا ہے لیکن منزل مقصود وہ تو ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے۔اسی کتاب میں اسی مقام پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی بھی تحریر ہے۔وہ فرماتے ہیں۔

''مابعد جدیدیت کا تصور ابھی زیادہ واضح نہیں ہے اور اس میں اور
پس ساختیات میں جو رشتہ ہے اس کے بارے میں معلومات عام
نہیں، اکثر دونوں اصطلاحیں ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے بدل
کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں البتہ اتنی بات صاف ہے کہ پس
ساختیات تھیوری ہے جو فلسفۂ قضا سے بحث کرتی ہے جبکہ مابعد

جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورتِ حال ہے یعنی جدید معاشرے کی
تیزی سے بدلتی ہوئی حالت، نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی
رویّے یا معاشرتی وثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی جو کرائسس کا درجہ رکھتی
ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو تھیوری کا بڑا حصّہ وہی ہے جو پس
ساختیات کا ہے یعنی مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ مقدمات وہی ہیں
جو پس ساختیات کے ہیں۔''

پروفیسر مارنگ نے ان مقدمات کو بہت سنجیدگی سے الگ الگ کر کے پڑھنے اور سمجھنے کی بات کہی ہے۔ کم وبیش یہی بات پروفیسر وہاب اشرفی بھی کہتے ہیں اور ایک قاری کی حیثیت سے میرا بھی یہی خیال ہے کہ ابہام وتفہیم کی یہ راکتیں، قربتیں اکثر خلطِ مبحث کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اس اختلاط کی گنجائش یوں بھی بنی رہتی ہے کہ دونوں کے طریقِ عمل طریقِ فکر دائرے اور رویّے میں بھی فرق ہے۔ اردو کے تعلق سے یہ بات بطور خاص کہی جا سکتی ہے۔ اسی لئے مصنف نے پورا اردو مابعد جدیدیت اور چند نکات کے ضمن میں ایسی بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور چند بے حد اہم سوالات اُٹھائے ہیں مثلاً

''کیا متعلقہ مغربی حوالے اردو کے لئے کافی ہیں اور اسی مزاج کے ہیں؟
کیا مغرب کی فضا سے ہماری اپنی فضا اتنی ہم آہنگ ہے کہ کسی ترمیم یا تنسیخ
کی ضرورت نہیں؟
کیا ہندوستان اور مشرق کا حال وہی ہے جو مغرب کا ہے، کیا یہاں کا مادی
اور روحانی ارتفاع مغرب کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے؟''

مصنّف نے اس تفریق ومخالفت کو ثقافت کے حوالے سے دیکھا ہے کہ اگر ہر ملک کی ثقافت جو بنیادی طور پر مقامی ہوتی ہے لیکن انسان کے ذریعہ ہی تشکیل پاتی ہے اگر اس کے معاملات ومقدمات کو سمجھ لیا جائے تو پروفیسر موصوف کے مطابق ڈور سلجھتی چلی جائے گی اور اردو مابعد جدید شعریات ازخود تشکیل پا جاتی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے تشکیک، اعتقاد، تکثیریت پر عمدہ اور عالمانہ گفتگو کی ہے اور بڑی ہنرمندی کے ساتھ اس کے ڈانڈے دریدا سے ملا دیئے ہیں کہ آج وہ بھی معنی کی کثرت کی ہی بات کرتا ہے اور مابعد جدیدیت بھی تکثیریت کی بات کرتی ہے۔ وہ یہ نکتہ بھی پیش کرتے ہیں ۔

''مابعد جدیدیت ایک طرح سے ٹالرنس کا سبق دیتی ہے جس میں

تشدد کی گنجائش نہیں، خوشگوار زندگی کے لئے Plurality لازماً
بہتر معلوم ہوتی ہے۔''

یہ نظریہ عمدہ تو ہے کہ ہر دور میں انسان اور انسانیت دوست نظریہ نے اس کی حمایت کی ہے۔ اردو میں ترقی پسندی کی مخالفت اور پھر بعد میں جدیدیت کی مخالفت میں کچھ ایسی فضا بن گئی جس کی وجہ سے ادبی سطح پر یہ بات نئی سی ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن انسان دوستی وصلح و آشتی کا یہ صوفیانہ مزاج تو ہندوستانی تہذیب میں پہلے ہی رچا بسا ہے۔ یا پروفیسر نارنگ کا یہ خیال ــ

''ادبی قدر، قدر محض نہیں ہوتی یہ معنی کی حامل ہوتی ہے اور معنی کا سر
چشمہ زندگی اور سماج کا تجربہ اور اس کے مسائل ہیں۔''

پروفیسر نارنگ کے اس خیال پر ایمان لایا جاسکتا ہے لیکن یہ زریں خیالات بھی کبھی ادب سے الگ نہیں ہوئے۔ ترقی پسند مفکرین نے ان موضوعات پر بے پناہ روشنائی خرچ کی ہے۔ آج وہ بدل بدل کر ایک نئے لفظی جامہ میں ہمارے سامنے آرہے ہیں، یہ بات بھی اچھی ہی ہے، ہر عہد کے مسائل کے مزاج الگ الگ ہوا کرتے ہیں لیکن ان کی بنیاد میں انسانی سرشت ہی کام کرتی نظر آتی ہے۔ اس کو دیکھنے اور سمجھنے کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے بارے میں مصنف نے یہ بات بھی کہی ـــــ ''فنکار آزاد ہے کہ وہ اپنے طور پر چیزوں کو دیکھے اور سمجھے اور پیش کرے، جبر کی کوئی صورت نہیں۔''

ترقی پسند فکر پر یہ الزام عائد ہوتا رہا ہے کہ اس نے نظریاتی وابستگی یا کمٹ منٹ کی بحث شدت کے ساتھ اختیار کی اور ایک مخصوص نظریہ کا ہونا بتایا اور کہیں کہیں یہ بھی کہ یہ نظریہ سیاسی ہو یا مارکسی۔ بعد کے جملہ سے اختلافات کی گنجائشیں نکلتی ہیں اور یہ اختلافات خود ترقی پسند نقادوں یا دانشوروں کے یہاں بھی دیکھے جاسکتے ہیں علاوہ ازیں ان کی پوری ایماندارانہ فنکارانہ وابستگی زندگی، اس کی تہذیب ومعاشرت سے ہے جس کو مابعد جدید ثقافت کہتے ہیں ـــــ سوال یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے پاس اپنے کچھ مقدمات ہیں اصول ونظریات ہیں تو پھر ان کی پابندی کرنے والوں کو ہی مابعد جدید کہا جائے گا اور پابندی کرنے والوں یا ان اصولوں کو برتنے والوں کی روش بہر حال آزادی کو متاثر کرے گی اور جبر کے قریب پہنچے گی۔ یہ کہنا کہ تخلیقیت اور آزادی میں مابعد جدیدیت کوئی اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتی بہت عمدہ اور کھلا ڈلا نظریہ تو ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ معقول اور اصل تخلیقیت پر آج تک پابندی نہیں لگائی جاسکی۔ ترقی پسند سرمایۂ تخلیق سے ایک مخصوص نظریہ جھلکتا تو نظر آسکتا ہے لیکن اگر اس کے بڑے فنکاروں نے

تخلیقیت پر پابندی محسوس کی ہوتی تو اتنی بڑی اور رنگا رنگ تخلیقات کا ڈھیر نہ لگ سکتا تھا۔ سماج، معاشرہ، اس کے تقاضے، مطالبے، زندگی کی اتھل پتھل، تصادمات، قتل و خون وغیرہ سب خود ایک مخصوص منفکرانہ قدر اور تشویشناک جبر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر ایک لاشعوری عمل سے گذرتے ہوئے بیانیہ تخلیق میں ڈھل جاتے ہیں۔ گجرات کے سانحہ پر کسی نقاد نے نہیں کہا کہ اس پر لکھا جائے اس کے باوجود گجرات کے حادثہ پر ہندوستانی فن کاروں نے منوں ٹنوں کاغذ سیاہ کر دیئے۔ زندگی کی گرمی، تلخی و تیزی اپنی قدر خود قائم کرتی ہے اور کبھی کبھی قدر خود ہی جبر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نقاد تو صرف نشاندھی کرتا ہے۔ آج کا دلت ادب، احتجاجی ادب، تانیثی ادب کسی منصوبہ یا جبر کے تحت نہیں پیدا ہوا ہے یہ سب زندگی کے ہاتھوں لہولہان ہو کر لکھا جا رہا ہے پوری آزادی اور بے باکی کے ساتھ۔ ایسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا اب آپ اسے ترقی پسندی کہئے۔ جدیدیت یا مابعد جدیدیت —— یا پھر مصنف کا یہ کہنا۔

> ''مابعد جدیدیت کا ایک اہم ایجنڈا حقوق انسانی اور شخصی آزادی بھی ہے یعنی اس کے دائرے میں وہ نئے عوامل ہیں جو نہ صرف انسانیت کے لئے فروغ کا سبب ہیں بلکہ ان کے خلاف جو بھی محاذ ہے اس سے برسر پیکار ہیں۔''

یہ سب باتیں جدیدیت کے خلاف تو جاتی ہیں لیکن ترقی پسندی کے خلاف نہیں پھر مابعد جدیدیت اور ترقی پسندی کے مابین نقطہ تفریق کیا ہے۔ اس نازک امر کی تفہیم کے لئے پروفیسر نارنگ کی تحریروں کو سمجھتے چلیں تو بہتر ہے۔

> ''مابعد جدیدیت ہر طرح کی کلیت پسندی اور فارمولہ سازی اور ضابطہ بندی کے خلاف ہے اور اس کے مقابلے پر مخصوص اور مقامی پرنیز کھلے ڈلے، فطری، بے محابہ اور آزادانہ اظہار عمل پر اصرار کرتی ہے۔''

روایتی فارمولہ سازی کی مخالفت تو ضرور کی جانی چاہئے کہ ادب بہر حال منزلہ ورکام کی نسخہ یا نقشہ کا فارمولہ نہیں ہے وہ آزاد و خلاقانہ فضا ہی میں پروان چڑھتا ہے لیکن ضابطہ بندی کی اصطلاح غور طلب ضرور ہے، ضابطہ بندی سے مراد اگر کسی سیاسی تنظیم کی ضابطہ بندی ہے تو اس پہ اعتراض کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر تخلیق و تنقید ادب یا زندگی کا کوئی بھی عمل ضابطہ اور منصوبہ کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ہوں یا

پروفیسر اشرفی یہ سب پڑھے لکھے اور ر رگ دانشوراں ہیں۔ رندگی بھر کام کیا ہے طاہر ہے کہ اں کے کاموں کا ایک منصوبہ وضابطہ تو رہا ہوگا۔ قرۃ العین حیدر کا تخلیقی عمل اور طریقۂ فکر صابطہ کا ہی مرہون منت ہے۔ پرواز تخیل بے صابطہ ضرور ہوتی ہے لیکن ان کی نفسیات وحسیات میں شعور کا ضابطہ ہی کام کرتا رہتا ہے۔ بڑی ترقی پسند تخلیق کبھی بھی فارمولہ ساری کے ساتھ نہیں لکھی گئی اور اگر کسی فارمولہ یا ضابطہ کے ساتھ لکھی گئی تو دیکھنا یہ ہے کہ فکر وفن کی معراج کیا ہے۔ کوئی بھی بڑا فارمولہ یا پروپیگنڈا بڑا ادب نہیں ہوتا البتہ ہر بڑا ادب پروپیگنڈہ ضرور ہوتا ہے۔ شاعری حواہ اقبال کی ہو یا فیض کی پروپیگنڈہ ہی ہے لیکن یہ ہمارے بڑے محترم شاعر ہیں جو ہر طبقۂ فکر میں پسند کئے جاتے ہیں۔ جدیدیت بھی پروپیگنڈہ سے الگ نہیں ہوسکی ہے، پروپیگنڈہ کے حلاف پروپیگنڈہ۔ مابعد جدیدیت پر جوان دنوں کام ہورہے ہیں ایک ضابطہ کے ساتھ پروپیگنڈے کا ہی رول ادا کررہے ہیں تو عرض مدعا یہ ہے کہ پروپیگنڈے یا فارمولے سے اس قدر گھبرانے اور بھڑکنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے تخلیقی عمل کا کسقدر خوبصورت اور پرکشش حصہ ہے پروپیگنڈہ غلط ہوسکتا ہے لیکن اس کا خوبصورت تخلیقی استعمال غلط نہیں ہوسکتا بالکل اسی طرح جیسے فن کے نام پر جدیدیت نے غلط تجربے کئے اور رسوائی وبیزاری کے سامان بہم کئے —— تو بات صرف اتنی ہے کہ آزادی خواہ شخصی ہو یا اجتماعی۔ معاملہ انفرادیت کا ہو یا تکثیرت کا تخلیق میں اس کا استعمال کس طرح ہوا ہے اور تخلیق کا دائرہ کس قدر وسیع ہوا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں مابعد جدیدیت اور شاعری، فکشن، تنقید وغیرہ پر باتیں کی گئی ہیں جو تفصیلی ہیں اور کاموں اور ناموں کو لے کر احتلاف کی گنجائش بھی پیدا کرتی ہیں اور یہ ایک انتہائی مشکل کام بھی ہوا کرتا ہے تاہم اس سے مصنف کے خلوص پر ذرا بھی شک نہیں ہوتا۔ یہ کیا کم ہوا کہ مصنف نے کئی گوشوں اور صنفوں کے حوالے سے عہد حاضر کے لکھنے والوں کو سنجیدگی اور توجہ سے پڑھا ہے اور ناموں کا شمار کیا ہے اور مابعد جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی ایک قطار کھڑی کردی۔ تنقید میں تو انہوں نے پروفیسر سید محمد عقیل اور راقم الحروف کو بھی شامل کرلیا۔ کم ازکم مجھ جیسے ہیچ مداں کے لئے پروفیسر وہاب اشرفی کی اس تاریخ ساز کتاب میں نام آجانا ہی باعث افتخار ہے۔ کتاب کے آخری تین صفحات میں آخری بات کہی گئی ہے جس کی چند سطریں یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

''آپ مابعد جدیدیت — مضمرات وممکنات'' مطالعہ کرچکے۔ اندازہ ہوا ہوگا کہ لازماً مابعد جدیدیت کے تصورات عمومی طور پر شادمانی

کے جویا ہیں کہ کس طرح زندگی خوشگوار اور سہل بن جائے Order of things میں اختلاف، انتشار اور پھیلاؤ کے باوجود یگانگت اور سکون اور امن کی فضا قائم رہے۔ حاشیائی لوگ۔ حاشیائی صنفیں یہاں تک کہ حاشیائی خیالات بھی بار پاتے رہیں —— ہم عالمی منظر نامے کی خبر تو رکھیں لیکن ان میں اس طرح گم نہ ہو جائیں کہ ہماری ادبی روایات دم توڑ دیں۔ اپنی ثقافت گم ہو جائے اور ہم خود صفحۂ ہستی پر صرسے زیادہ حیثیت نہ رکھیں۔ قصہ مختصر کہ مابعد جدیدیت ہمیں اپنی جڑوں کی طرف لے جاتی ہے، ہماری ثقافت کی نیرنگی اور تنوع کے پس منظر میں نیا ادبی منظر نامہ پیش کرتی ہے جن سے کترانا اپنے سے روٹھنے کے مترادف ہے۔''

ان جملوں میں آپ کو تاریخ، تہذیب، مذہب، تصوف اور اشتراکیت سبھی کی جھلکیاں نظر آئیں گی اور سچ بات یہ ہے کہ ادب صرف ادب نہیں ہوتا اس میں یہ تمام اقدار و افکار ہمہ وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ مابعد جدیدیت یا کم از کم پروفیسر وہاب اشرفی اپنی اس گراں قدر تصنیف کے ذریعہ یہی پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔

''مابعد جدیدیت۔ مضمرات و ممکنات'' اس عہد کی تنقید میں ایک گراں بہا اضافہ ہے اور اختلافی اشاریہ بھی اور جو کتاب اختلاف و اضطراب پیدا کرے اور گفتگو کے امکانات بھی پیدا کرے اُسے میں ہر حال میں کامیاب کتاب تصوّر کرتا ہوں۔ ایسی معیاری، فکر انگیز، معنی خیز کتاب لکھنے کے لئے میں پروفیسر وہاب اشرفی کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

پروفیسر وہاب اشرفی سے ایک مکالمہ

ہمایوں اشرف آپ سے کئی مرتبہ درخواست کی کہ آپ سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں، آپ ٹالتے رہے ہیں، لیکن آج ٹیپ ریکارڈ روغیرہ کے ساتھ آیا ہوں اور مجھے معلوم ہے اس وقت آپ فری بھی ہیں تو چند سوالات کے جوابات دیجئے۔

وہاب اشرفی آپ کو کیسے معلوم کہ میں فرصت میں ہوں؟

ہمایوں اشرف مجھے آپ کے ساتھ رہنے اور آپ کی مصروفیات کا علم ہے اور آج تو

وہاب اشرفی آپ کو معلوم نہیں ہے شاید کہ جب میں بالکل خالی رہتا ہوں تو زیادہ مصروف رہتا ہوں، کسی موضوع، کوئی شعر، کوئی ادبی پروجیکٹ یا کسی مضمون کے بارے میں دماغ میں مسلسل رو، جی ہاں مسلسل خیالات رواں دواں رہتے ہیں، گویا خام مواد پکتا رہتا ہے۔

ہمایوں اشرف شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کبھی کوئی مضمون یا مقالہ ایک ہی بیٹھک میں املا کروا دیتے ہیں؟

وہاب اشرفی دراصل متعلقہ باتیں ذہن میں ترتیب پاتی رہتی ہیں۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ رہتا ہے۔

ہمایوں اشرف گویا آپ ذہن میں لکھتے بھی رہتے ہیں؟

وہاب اشرفی جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے۔

ہمایوں اشرف کیا یہ صورت ہمیشہ رہی ہے یا رہتی ہے؟

وہاب اشرفی ہاں جب کچھ لکھنا ہوتا ہے تو متعلقہ موضوع کے بارے میں دماغ میں الٹی سیدھی باتیں آنے لگتی ہیں۔

ہمایوں اشرف تو ان میں انتشار کی کیفیت بھی رہتی ہوگی؟

وہاب اشرفی لیکن وہ آپ ہی آپ یعنی نکتے Settle ہو جاتے ہیں۔

ہمایوں اشرف یعنی؟

وہاب اشرفی دماغ میں انتشار کو بھی ایک راہ مل جاتی ہے، لامعلوم طریقے پر ایک ترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمایوں اشرف لیکن خیالات کے لئے مواد کہاں سے آتا ہے؟ کیا مطالعے کی ضرورت نہیں پڑتی؟

وہاب اشرفی مطالعے کے بغیر تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ لکھوا نہیں سکتا۔ دراصل دن رات کے کئی گھنٹے تو اسی عمل میں گذرتے ہیں، آپ نے خود

ہمایوں اشرف جی ہاں، میں جب آپ کو مطالعہ کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسا انہماک!

وہاب اشرفی میں عبادات کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ہوں، لیکن پڑھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ عبادت کر رہا ہوں، اور عبادت میں انہماک ضروری ہے۔

ہمایوں اشرف سنا ہے آپ ابتدائی حافظی تعلیم کے بعد کسی مدرسے میں عربی پڑھنے اور عالم فاضل بننے کی راہ پر لگائے جانے والے تھے؟

وہاب اشرفی بالکل درست۔

ہمایوں اشرف پھر کیا ہوا؟

وہاب اشرفی بہار کے ۱۹۴۶ء کے فسادات سے ہم سب متاثر ہوئے۔

ہمایوں اشرف ذرا تفصیل بتایئے۔

وہاب اشرفی میں ابھی بہت بچہ تھا، ماموں جان نے ابا کی مرضی کے خلاف کاکو اسکول میں میرا داخلہ کروادیا تھا، میں چھٹے درجے میں تھا۔ ایک روز صبح کی اذان کے وقت بی بی پور کے لوگوں یعنی میرے گاؤں والوں کو معلوم ہوا کہ ہندوؤں کی کثیر تعداد مسلح ہو کر ہم سبھوں کو گھیر چکی ہے اور اب ہم سب کے سب قتل ہونے والے ہیں، لیکن ہم بچ گئے تھے۔ بی بی پور اور کاکو کے بیچ حضرت بی بی کمال کا مزار یعنی درگاہ ہے۔ اس سے گذرتے ہوئے سب کے سب کاکو آچکے تھے، یہ جگہ میری نانیہال بھی تھی۔ وہاں بھی محاصرہ ہوا لیکن بلوائی قابو نہیں پاسکے۔

ہمایوں اشرف تو کیا آپ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا؟

وہاب اشرفی جی ہاں لیکن بلوے کی شدت، غایت وغیرہ کے بارے میں مجھے کوئی واضح شعور نہیں تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا۔

ہمایوں اشرف اس کے بعد کیا ہوا؟
وہاب اشرفی ہم لٹے پٹے کلکتہ آ گئے۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ جہاں ہم لوگوں نے پناہ لی تھی، دراصل وہ کسی ہندو بنگالی کا مکان تھا، کئی مکانات پر مسلم آبادی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہمارا خاندان ایک مکان میں آ گیا۔
ہمایوں اشرف کلکتہ میں وہ مکان کس محلّے میں تھا؟
وہاب اشرفی بنیاپوکھر میں۔ مکاں کے سامنے ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ وہ آج بھی ہے۔ اس میں بھی بہت سے بہاری آ گئے تھے اور رہ رہے تھے۔
ہمایوں اشرف اس گھر کا کوئی تجربہ؟
وہاب اشرفی جی ہاں، مجھے یاد ہے کہ کلکتہ میں فسادات ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سفید دھوتی کرتے میں ایک شخص میرے مکاں کے دروازے سے ذرا آگے بڑھا کہ پیچھے سے آ کر ایک شخص نے اسے خنجر مار دیا۔ وہ فوراً گر پڑا۔ میں نے یہ منظر دیکھا اور بے ہوش ہو گیا، کئی دن تک ڈراؤنے خواب آتے رہے۔
ہمایوں اشرف کون مارا گیا تھا؟
وہاب اشرفی وہ ایک ہندو بنگالی تھا، شاید اسے بھروسہ رہا ہوگا کہ وہ اسی محلّے کا ہے۔ شاید اس کی معصومیت نے اس کی جان لی۔
ہمایوں اشرف پھر کیا ہوا؟
وہاب اشرفی پولس آئی اور لاش اٹھا کر لے گئی۔ مجھے کئی دنوں تک بخار رہا، میں والدہ کی پریشانیوں کو سوچ کر بہت ملول ہو جاتا ہوں لیکن دروازہ پر کے قتل نے مجھے آج تک بے چین کر رکھا ہے۔ جب بھی سوچتا ہوں وہ منظر سامنے آ جاتا ہے۔
ہمایوں اشرف آج تک؟
وہاب اشرفی جی ہاں، ایک ماہر نفسیات سے دریافت کیا تو بتایا کہ وہ میرا فکریشن (Fixation) ہے۔ پھر اس Term کی تفصیل کتابوں میں دیکھی۔ کہیں کہیں افسانے وغیرہ کی تنقید میں، میں نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔
ہمایوں اشرف گویا اس طرح آپ سے عربی ادارے اور مذہبی تعلیم دور ہوتی چلی گئی اور آپ انگریزی طریق تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔
وہاب اشرفی یہی سچ ہے۔

ہمایوں اشرف: تو آپ نے کلکتہ میں کہاں کہاں تعلیم حاصل کی؟

وہاب اشرفی: چھٹے درجے میں میرا داخلہ اسلامیہ ہائی اسکول میں کرایا گیا۔ اسکول بنیا پوکھر ہی میں تھا۔ میں پاس ہوا تھا تو نمبر اچھے تھے اسی لئے مجھے مدرسہ عالیہ جو ویلز لی میں تھا منتقل کر دیا گیا۔ وہاں دسویں میں آیا ہی تھا کہ بھائی صاحب عبدالجبار اشرفی مجھے لے کر مشرقی پاکستان، ڈھاکہ آگئے۔

ہمایوں اشرف: ذرا بتایئے کہ اس وقت مدرسہ عالیہ میں کون کون ساتھی قابل لحاظ تھے؟

وہاب اشرفی: کئی اچھے طالب علم تھے لیکن ان میں نمایاں وکیل اختر اور مرتضیٰ رضوی تھے۔ ہم تینوں ہم جماعت تھے، وکیل اختر اور مرتضیٰ رضوی شعر کہنے لگے تھے۔ میری بھی تک بندی شروع ہو چکی تھی۔ ہم لوگ اسکول کے ذہین طالب علم سمجھے جاتے تھے۔ وکیل اختر ہم میں بہتر تھے۔ بعد کو وہ اسی اسکول کے ہیڈ مدرس ہوئے۔ مرتضیٰ رضوی فلسفے کے پروفیسر ہوئے، ملت کالج دربھنگہ، متھلا یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ دونوں ہی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کے فوت ہوئے۔ دونوں اچھے شاعر تھے۔ ان کا تجزیہ باقی ہے۔ ایسے ذہین ساتھیوں اور فنکاروں کی موت کا سوچ کر آج بھی رقت طاری ہو جاتی ہے۔

ہمایوں اشرف: آپ نے کہا کہ آپ مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ ہجرت کر گئے تو اس کے بعد کیا ہوا؟ کچھ تفصیل بتایئے، آپ کی داستان دلچسپ ہے۔

وہاب اشرفی: میں نے بتایا تھا کہ میں دسویں درجے میں تھا کہ بھیا ڈھاکہ لے آئے، میٹرک کا امتحان دو ماہ کے بعد ہونے والا تھا۔ کہنے لگے تم اب فائنل امتحان دے دو۔ میں اپنے بھائی کی کوئی بات ٹالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ تو میرا داخلہ بیک ڈیٹ سے میٹرک فائنل میں ہو گیا۔ ایک سال کی چھلانگ لگا کر میں اب میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔ اسکول تھا رحمت اللہ ہائی اسکول، ڈھاکہ۔ میں کسی طالب علم سے بھی واقف نہیں تھا۔ مدرسہ عالیہ میں تاریخ کے نصاب میں ہندوستانی تاریخ اور ورلڈ ہسٹری کا کچھ حصہ تھا۔ میری تیاری اسی طرح ہوئی تھی۔ اب امتحان کا پرچہ جو سامنے تھا تو اس میں ورلڈ ہسٹری کی جگہ اسلامی تاریخ تھی۔ بچپن کا کچھ پڑھا کام آیا، کچھ مولود کی محفلوں میں سن رکھا تھا۔ کچھ مذہبی لوگوں کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا جو جی میں آیا لکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ نمبر میری توقع سے کہیں زیادہ تھے اور میں انتہائی اطمینان سے میٹرک پاس کر گیا۔ بھیا بہت

خوش ہوئے اور مجھے دس روپے عنایت کئے۔ ابھی ایک رسالے سے معلوم ہوا ہے کہ مشہور شاعر ساقی فاروقی اسی سال اسی اسکول سے میٹرک کا امتحان دے رہے تھے لیکن میری ان سے علیک سلیک بھی نہیں ہو سکی تھی۔

ہمایوں اشرف میٹرک کی تعلیم کے بعد آپ کی مزید تعلیم کا رخ کیا رہا؟

وہاب اشرفی میں بری طرح بے سمتی کا شکار رہا۔ اسی زمانے میں کاکو کے ایک صاحب جو کامرس کی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور تھے ڈھاکہ میں بینک کے بڑے اونچے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے بھیا کو بتایا کہ کامرس ہی آج کی بہترین پڑھائی ہے۔ میں کامرس پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے مارکس دیکھ کر قائداعظم محمد علی جناح کالج کے پرنسپل نے بھیا کو بتایا کہ اگر لڑکا آرٹس پڑھتا ہے تو میں اسے اسکالرشپ بھی دوں گا لیکن مجھے ائی کام میں داخلہ لینا ہی پڑا۔

ہمایوں اشرف تو آپ نے قائداعظم کالج سے آئی کام پاس کیا؟

وہاب اشرفی نہیں، پھر مجھے مسلسل بخار آنے لگا۔ علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بھیا بھی کئی طرح سے پریشان تھے۔ صرف مجھے ہی لے کر وہ ڈھاکہ آ گئے تھے۔ والدین، خود بھیا کی فیملی ہندوستان رہ گئی تھی، اتا نے صاف کہہ دیا تھا وہ ہجرت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان دنوں بنگالیوں نے اردو کے خلاف مظاہرہ کرنا شروع کیا تھا۔ پھر پاسپورٹ ویزا کا چکر شروع ہونے والا تھا تو بھیا نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی۔ میری بیماری بھی شدید ہو گئی تھی۔ تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جانا چاہئے۔ اردو کے خلاف مظاہرے سے وہ بہت دل برداشتہ تھے۔ ہم لوگ ہندوستان آ گئے۔ میرا علاج ہوا، میں رو بہ صحت ہو گیا لیکن میری تعلیم کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ بھیا نے میرا داخلہ سٹی کالج، کلکتہ میں کرا دیا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔

ہمایوں اشرف گویا آپ کی مرضی کے خلاف آئی کام میں آپ کا داخلہ ہوا؟

وہاب اشرفی جی ہاں، حیرت کی بات یہ تھی کہ آئی کام میں آئی اے کا نصاب بھی تھا۔ یعنی اردو، انگریزی، سیوکس ساتھ ساتھ کامرشیل جغرافیہ، کامرشیل ارتھمیٹک، بک کیپنگ اور کمرشیل اکونامکس۔

ہمایوں اشرف آپ اس سخت مرحلے سے کیسے نکلے اور گریجویشن کس طرح ہوا؟

وہاب اشرفی معلوم نہیں ذہن کس طرح لچکدار ہو گیا، میں نے سارے مضامین سے انصاف کیا۔

جب نتیجہ آیا تو میں کامرشیل ارتھمیٹک اور بک کیپنگ تک میں اچھی طرح کامیاب ہوا تھا۔لیکن قبل اس کے کہ بھیا کچھ کہتے میں نے چپکے سے ٹی سی لی اور سنٹرل کالج جس کے نام دوبار مدلے اسلامیہ کالج اور مولانا آزاد کالج میں داخلہ لیا اور ایڈمیشن ٹسٹ پاس کر کے انگریزی آنرس کا طالب علم ہو گیا۔ بھیا سمجھے کہ بی کام پڑھ رہا ہوں۔ انگریزی آنرس کے طلباء کی تعداد بہت کم تھی۔ پرنسپل جواطالوی تھے،فرینڈ پریرا،خود انگریزی کے بیشتر کلاس لیا کرتے تھے۔ میں ۱۹۵۴ء میں امتیاز کے ساتھ گریجویٹ ہو گیا۔

ہمایوں اشرف اس کے بعد کی تعلیم؟

وہاب اشرفی بہت ٹیڑھی میڑھی رہی۔ میں نے معلوم کیا کہ کون سا مضمون ایسا ہے جس میں ایم اے کرنے سے باہر یعنی غیر ملک جانے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے، مجھے بتایا گیا کہ لسانیات یہاں پڑھائی جاتی ہے Comparative Phililogy میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

ہمایوں اشرف تو آپ نے تقابلی لسانیات کے امتحانات پاس کئے؟

وہاب اشرفی نہیں، یہ بات حیرت کی ضرور ہے۔ میں بہت ذوق و شوق سے Comparative Phililogy کا ایک سال پورا کر چکا تھا اور آخری سال میں تھا کہ بھیا کو میرے بارے میں سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔ پہلا غم انہیں یہ تھا کہ میں نے کامرس کو چھوڑ کر ناقابل معافی جرم کیا اور انہیں مغالطے میں رکھا، دوسرا یہ کہ Comparative Phililogy جیسا نیا مضمون صرف پاگل یا احمق پڑھتے ہیں، پڑھنا ہی تھا تو انگریزی میں کیا برائی تھی؟ تیسرا یہ کہ میں نے اخبارات سے وابستہ ہو کر دو بجے رات تک غائب رہنے کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔

ہمایوں اشرف گویا آپ اخبارات سے بھی وابستہ رہے ہیں؟ کیسا تجربہ رہا؟ آپ کے برادر محترم نے آپ کو کیوں روکا یا اپنی ناراضگی کا اظہار کیا؟

وہاب اشرفی میں دو بجے تک یونیورسٹی سے چھوٹ جاتا،اس وقت کلکتہ کے اردو اخبارات سروس کی نیوز کو ترجمہ کر کے چھاپتے تھے، پھر انگریزی اخبارات پر نشانات لگا کر انہیں ترجمہ کیا جاتا۔ اس طرح اردو کے اخباروں کا پیٹ بھرا جاتا تھا۔ کئی مترجم اس کام پر لگے تھے، انہیں کالم کے حساب سے اجرت دی جاتی تھی۔ دو بجے رات کو فرصت ملتی۔ بھیا گھر پر پریشاں رہتے۔

ہمایوں اشرف تو آپ کس کس اخبار سے وابستہ رہے؟

وہاب اشرفی تین اخبار سے۔ ''الحق'' شام کا اخبار تھا، اس سے۔ کچھ دنوں تک ''عصر جدید'' سے، پھر ''اخوت'' سے۔ یہ سب روزانہ اخبارات تھے۔

ہمایوں اشرف اخباری زندگی کی کچھ یادیں؟

وہاب اشرفی کئی تلخ اور شیریں یادیں ہیں۔ ''الحق'' کے ایڈیٹر سنجر عظیم آبادی سے اپنی اجرت طلب کرتا تو کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتے، کبھی کسی ہوٹل کی سیر کرا دیتے تو کبھی سنیما کے پاس مہیا کرتے۔ پیسہ وقت سے ملتا۔ ''عصر جدید'' میں ریگولر پیمنٹ تھا۔ ''اخوت'' دو چار آدمیوں کی ایما پر نکلا تھا۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ اکبر بکّی تھے تو بکّی لیکن بڑے مخیّر تھے۔ ہم لوگ چار گریجویٹ جن میں اہم ترین نورالدین تھے اکبر صاحب کو ہموار کر لیا اور ''اخوت'' کی بنیاد پڑ گئی۔ چیف ایڈیٹر ناظر الحسینی تھے۔ بعد میں شین مظفر پوری بھی آ گئے تھے۔ ''اخوت'' میں چند مہینے ہوئے تھے کہ میری سرکاری ملازمت ہو گئی۔ حالانکہ ''اخوت'' میں پیسے کی کمی نہیں تھی۔

ہمایوں اشرف سرکاری ملازمت کس طرح ہو گئی؟

وہاب اشرفی معلوم نہیں کیوں، بھیا میری طرف سے طرح طرح کے شکوک میں مبتلا رہتے تھے۔ Comparative Philiilogy سے عاجز تو تھے ہی اردو اخبار کے لوگوں کی بیڑی اور چائے نوشی نہ معلوم کس طرح ان کے مشاہدے میں تھی۔ وہ اردو صحافت کو کوئی کیریئر نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ''اخوت'' کے زمانے سے تقریباً سات آٹھ ماہ پہلے انہوں نے لائف انشورنس کارپوریشن کے فارم پر مجھ سے دستخط کروایا تھا، ایک دن معلوم ہوا کہ اسسٹنٹ کی ملازمت کے لئے مجھے جنرل نالج کے امتحان میں بیٹھنا ہے، سو بیٹھ گیا اور معلوم نہیں کیسے کامیاب بھی ہو گیا۔ میرا انٹرویو ہوا، اناپ شناپ جواب دیا، بنگالی افسروں نے نہ معلوم میرے اندر کیا پایا کہ مجھے سلیکٹ کر لیا اور پٹنہ پوسٹ کر دیا۔ لائف انشورنس حال ہی میں نیشنلائزڈ ہوا تھا۔ بھیا کو ایک اچھا موقع ملا، میں پروٹیسٹ کرتا رہ گیا۔ اپنی پڑھائی کی دہائی دی، وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔ میں پٹنہ آ گیا۔ میں لائف انشورنس کارپوریشن، پٹنہ میں دوسرا مسلمان ملازم تھا جو ڈویزنل آفس میں آیا تھا اور سخت بدحواس تھا۔

ہمایوں اشرف آپ لائف انشورنس سے کتنے سالوں تک وابستہ رہے؟

وہاب اشرفی تقریباً پانچ سال لیکن اس دوران میں پرائیویٹ سے ایم اے کے امتحانات بھی دیتا رہا۔ انگریزی، اردو اور فارسی۔ پٹنہ سے ماہنامہ ''صنم'' بھی نکالا۔

ہمایوں اشرف دفتری کام کس طرح کرتے تھے، پھر امتحانات کے لئے وقت کیسے نکالتے تھے؟ ''صنم'' کے لئے وقت یعنی؟

وہاب اشرفی دفتر نام کو جاتا، سارا وقت ماہنامہ ''صنم'' اور ادبی معاملات سے نمٹنے میں لگ جاتا۔ لائف انشورنس کے قوانین سخت تھے۔ میرا ریکارڈ خراب ہوتا رہا پھر یہ ہوتا کہ دفتر آیا اور سہیل عظیم آبادی صاحب ریڈیو اسٹیشن سے فون کرتے آجاؤ، رینو بھی ساتھ رہیں گے۔ پھر وہی ادب اور ادیب، رات کو کچھ وقت ملتا تو امتحانات کے لئے پڑھتا، افسانے بھی لکھتا۔

ہمایوں اشرف رینو کون؟

وہاب اشرفی بھئی ہمارے پھونیشور ناتھ رینو، ''میلا آنچل'' والے، وہ پیتے اپنے ساتھ لاتے، ریسٹوران میں بیٹھ کر ہم لوگ کھاتے پیتے۔ اس زمانے میں جہاں تک یاد آتا ہے انھوں نے ''مارے گئے گلفام'' بھی لکھا تھا۔ دونوں ہی بڑے پیارے لوگ تھے۔ بیلون بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ بہت جلد گھل مل جاتے دونوں ہی۔

ہمایوں اشرف کیا سہیل عظیم آبادی نے ہی آپ کو افسانہ نگاری کی طرف مائل کیا؟ یا رینو نے؟ آپ کا پہلا افسانہ کون تھا؟

وہاب اشرفی میں ایسا نہیں سمجھتا۔ خاموشی سے کہانیاں تو لکھتا تھا لیکن چھپوانے کی نوبت ۱۹۵۸ء ہی میں آئی۔ میرا پہلا افسانہ تھا ''اپنی اپنی راہ'' بیسویں صدی میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد میں مسلسل افسانے ہی لکھتا رہا۔

ہمایوں اشرف گویا آپ نے ''صنم'' کے اجراء کے ساتھ افسانہ نگاری شروع کی اور اس طرح آپ کے ادبی کیریر کا آغاز ہوا؟

وہاب اشرفی نہیں، ایسا نہیں ہے۔ کلکتہ میں صحافتی زندگی اور طالب علمی کے زمانے میں میں نے Tenyson کی یہ منظوم المیہ کہانی Enoch Arden کا ترجمہ کیا تھا۔ مجھے بہت پسند تھی۔ آئی اے کے کورس میں تھی۔ بہت طویل نظم ہے، میں نے رواں بیانیہ میں ترجمہ کرکے ''معاون'' میں بھیج دیا۔ مظہر امام ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے اسے چھاپا۔ مجھے مظہر امام سے علیک سلیک بھی نہیں تھی۔ میں واقف ضرور تھا، ممکن ہے وہ

مجھے نہیں جانتے ہوں۔

ہمایوں اشرف تو یہی آپ کی پہلی ادبی تحریر ہے جو شائع ہوئی؟

وہاب اشرفی نہیں، اس سے بہت پہلے میٹرک اور آئی کام کے زمانے میں، میں شعر کہتا اور اخباروں میں چھپواتا تا۔ میری غزلیں ''عصر جدید'' اور ''آزاد ہند'' میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ میں نے کلکتہ سے رخصت ہوتے ہوئے ایک الوداعی عشقیہ نظم ''اخوت'' میں چھپوائی تھی۔

ہمایوں اشرف پھر آپ نے شاعری اور افسانہ نگاری دونوں ہی ترک کر دی؟

وہاب اشرفی سچ تو یہ ہے کہ میں نے شاعری کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ غور نہیں کیا تھا، محض روایت اور تتبع کی راہ سے غزلیں لکھتا تھا، گویا برائے نام لیکن میرے استاد اور شاعری کے استاد نے تو مجھے اور بھی دل برداشتہ کر دیا۔ ایک غزل اصلاح کے لئے دی، غزل واپس ملی تو وہ سرتاسر استاد کی تھی یعنی حضرت بیجو و کلکتوی کی، میں نے فیصلہ کیا یہ میری راہ نہیں ہے۔ لیکن گاہے گاہے اور چپکے چپکے آج بھی شعر کہتا ہوں، شاید صرف اپنے لئے۔

ہمایوں اشرف تو آپ کی شاعری اب شائع نہیں ہوگی کیا؟ یہ تو اچھا نہیں ہے۔

وہاب اشرفی کیا اچھا ہے اور کیا برا میں کہہ نہیں سکتا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کبھی شائع نہ ہوں گی، ویسے ابھی تک میں نے جو کچھ کہا ہے وہ پرائیویٹ اور پرسنل ہی ہے، ایک بڑا حصّہ تو ضائع بھی ہو چکا ہے، میں   ت ہی نہیں دی کبھی۔

ہمایوں اشرف اور افسانہ لکھنا کیوں   ؟

وہاب اشرفی (ایک سرد آہ کے ساتھ) میں بہت تیزی سے افسانے لکھ رہا تھا، ایک مجموعہ ترتیب دیا، اور سارے افسانے کو اوریجنل شکل میں رسالوں سے کاٹ کاٹ کر حسات دہر ناصری کے حوالے کیا۔ وہ ایک پریس کے منیجر تھے، کتابت کی ذمہ داری اور دیکھ بھال ان ہی کے ذمہ تھی۔ ایک چھوٹی سی کتاب کی دوکان بھی کھولی تھی انہوں نے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ موصوف مظہر امام کے ماموں ہیں، پھر ہوا یہ کہ ایک شب وہ مشرقی پاکستان پراسرار طریقے پر فرار ہو گئے۔ میری کہانیوں کا پلندہ بھی لیتے گئے۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا، میں بیمار ہو گیا، نفسیاتی طور پر میں بہت الجھ کر رہ گیا تھا۔ افسانے سب کے سب چھپے ہوئے تھے، چند پاکستان کے وقیع رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ میں ہمیشہ سے اپنی تحریروں کا کوئی ریکارڈ، کاپی وغیرہ نہیں رکھتا، ہوش نہیں رہا کہ انہیں پھر سمیٹوں۔

پھر بڑی مشکل سے ایک افسانہ لکھا۔ جدیدیت کا زور شروع ہو چکا تھا۔ ''شب خون'' میں بھیج دیا۔ افسانہ شائع ہوا لیکن بالکل آخری صفحات پر۔ ایک اور صدمہ ہوا، ایک صاحب جنہیں بڑی مشکل سے ''بیسویں صدی'' میں چھپوایا تھا، اوّلین صفحات گھیرے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی افسانہ نگاری اور صلاحیت دونوں ہی کی خبر تھی، مجھے لگا کہ میں افسانے نہیں لکھ سکتا، بس لکھنا بند کر دیا۔

ہمایوں اشرف وہ کون سا افسانہ تھا؟ یعنی آخری افسانہ جو ''شب خون'' میں شائع ہوا؟

وہاب اشرفی ''کھویا ہوا چہرہ''۔

ہمایوں اشرف لیکن پروفیسر احمد حسین آزاد نے آپ کی کہانیوں کا ایک انتخاب تو شائع کیا ہے اور طویل مقدمہ بھی لکھا ہے۔

وہاب اشرفی جی ہاں میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اتنی محنت کی، ادھر ادھر سے افسانے تلاش کیے، طویل تنقیدی مضمون لکھا، پیسے بھی انہوں نے ہی لگائے لیکن ان میں سارے افسانے نہیں ہیں۔

ہمایوں اشرف تنقید کب سے شروع کی آپ نے؟

وہاب اشرفی ترک افسانہ نگاری کے بعد سے نہیں، ایک عرصہ پہلے یعنی بی اے کے وقت میں نے مضامین لکھنے شروع کیے تھے۔ کلکتہ کے ایک شاعر تاباں القادری تھے، ان کا انتقال ہوا تو میرے دوست سلیمان ڈوپلے نے ایک کتاب ترتیب دینے کا عزم کیا۔ مجھ سے مضمون لکھنے کی فرمائش کی، وہ پہلا باضابطہ تنقیدی مضمون تھا جو میں نے تاباں پر لکھا۔ کتاب ''نقوش تاباں'' کے نام سے شائع ہوئی، یہی میرا پہلا تنقیدی کام ہے۔ کلکتہ کے حلقے میں بہت مقبول ہوا تھا وہ مضمون۔ افسوس کہ وہ کتاب میرے پاس نہیں ہے۔ ویسے اس سے پہلے میں نے Narrative Poetry پر ایک طویل مقالہ انگریزی میں لکھا تھا۔ وہ سنٹرل کلکتہ کالج کے کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔ اسی میں پروفیسر عبدالباقی صدر شعبہ فلسفہ کا ایک مضمون میں نے ترجمہ کیا تھا اور اسی میگزین میں چھپا تھا۔ میرے پاس ان کی کوئی کاپی نہیں ہے۔ میری اوّلین تحریریں یہی ہیں۔

ہمایوں اشرف باتوں باتوں میں، میں خود بہک گیا، میں نے تو یہ پوچھا ہی نہیں کہ لائف انشورنس کی ملازمت سے علیحدگی کس طرح ہوئی اور پھر اس کے بعد کیا ہوا؟

وہاب اشرفی میں نے بتایا تھا کہ انشورنس کی ملازمت کا ریکارڈ روز بروز خراب ہو رہا تھا اسی

دوران میں یو جی سی دہلی میں جونیئر فیلوشپ کی درخواست دی۔ اس زمانے میں دہلی ہی سے انتخاب ہوتا تھا۔ مجھے اسکالرشپ مل گئی۔ ظاہر ہے یہ معاملہ صرف تین سال کے لئے تھا لیکن میں نے استعفیٰ دے دیا۔ بھیا نے بہت پروٹیسٹ کیا۔ میری شادی بھی ہو چکی تھی۔ دو بچے کا باپ بن چکا تھا۔ ذمہ داریاں بہت تھیں۔ لوگ میری اس کارروائی کو غیر ذمہ دارانہ فعل سمجھتے تھے۔ مستقل ملازمت ترک کرنا گویا میری بد دماغی تھی لیکن میں اپنے طور پر خوش تھا۔ جب اس کا ٹرم ختم ہوا، تو میں واقعی بے کار ہو گیا۔ شاد عظیم آبادی کی نثر نگاری کے سلسلے میں مجھے ایک ہاتھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی اور دوسرے ہاتھ مجھے باہر جانے کا دروازہ دکھایا گیا۔

ہمایوں اشرف پھر کیا ہوا؟ ذرا تفصیل سے بتایئے۔

وہاب اشرفی بڑی مشکلوں میں رہا، میرے بہت برے دن تھے وہ۔ لیکن مسز جموار نے میری مشکلوں کو قدرے آساں کیا۔ انہوں نے ایک پرائیویٹ کالج اردو گرلس کالج قائم کر رکھا تھا، مجھے وہاں انگریزی پڑھانے پر رکھ لیا۔ عجب ذہن و دماغ تھا اس کا، جو بھی اسٹاف کے لوگ تھے انہیں وقت پر تنخواہ دیتیں، گو کہ رقم بہت معمولی ہوتی، اس کے شوہر انجینئر تھے۔ ایک روز میں نے سنا کہ مسز جموار کے شوہر بیمار ہیں، میں عیادت کے لئے گیا، انہیں مسلسل ہچکیاں آ رہی تھیں، چند دنوں میں اسی عالم میں اس کا انتقال ہو گیا لیکن مسز جموار نے اس مہینے بھی لوگوں کی تنخواہیں ادا کیں۔ اس کی محنت سے کالج وقیع ہوتا گیا اور آج پٹنہ کا ایک پروقار کالج ہے، کانسٹی ٹیونٹ ہو چکا ہے۔ مسز جموار ریٹائر ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد داناپور کالج میں اردو کا لکچرر ہو گیا۔ پھر مجھے سینیر یو جی سی فیلوشپ مل گئی۔ ماہانہ ۵۰۰ روپے ملنے لگے۔ ۱۹۶۹ء کے اواخر میں مگدھ یونیورسٹی میں ایک جگہ نکلی۔ میں امیدوار ہوا۔ اس طرح باضابطہ اردو کا لکچرر ہو کر گیا آ گیا۔ ابھی چھ برس پورے ہی ہوئے تھے کہ رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی جگہ خالی ہوئی، شعبہ کی صدارت بھی اسی کے ساتھ آنے والی تھی۔ میں نے اپلائی کیا، میرا انتخاب ہو گیا۔ اس طرح میں ۱۹۷۶ء میں ریڈر اور شعبہ کا صدر ہو گیا۔ پھر ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ہو گیا۔ ریٹائر ہونے کو دو سال باقی تھے کہ میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ وقت پورا کر کے یہاں سے الگ ہوا تو بہار اسٹیٹ انٹرمیڈیٹ کونسل کا چیرمین مقرر ہوا۔ اس کا وقت بھی پورا ہوا۔

ہمایوں اشرف لیکن مجھے لگتا ہے کہ جب گیا میں تھے تو آپ ادبی میپ پر کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو گئے، اس کی وجہ؟

وہاب اشرفی کہہ نہیں سکتا کہ ادبی میپ پر نمایاں ہو گیا، لیکن یہ درست ہے کہ کلام حیدری صاحب کی ادارت میں نکلنے والے دونوں رسالے ماہنامہ ''آہنگ'' اور ہفتہ وار ''مورچہ'' بہت مقبول تھے، پڑھے جاتے تھے، میں نے ان میں مضامین، تبصرے، کالم وغیرہ لکھنا شروع کیا۔

ہمایوں اشرف ''مورچہ'' ہی میں تو وہ بحث آئی تھی یعنی ادبی معرکہ ہوا تھا جس میں محمود ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی ایک فریق کے طور پر آپ کے سامنے تھے۔

وہاب اشرفی ہاں، وہ ادبی بحث ہوئی تھی اور اب وہ کتابی صورت میں چھپ گئی ہے۔

ہمایوں اشرف ہاشمی صاحب سے آپ کے تعلقات کیسے رہے؟ اور فاروقی صاحب سے؟

وہاب اشرفی محمود ہاشمی میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ ان کے علم اور مطالعے کی میں قدر کرتا ہوں۔ اور دل سے کرتا ہوں۔ فاروقی صاحب کے علم و کمال کا میں قائل ہوں۔ ان کی عظمت کا معترف ہوں، جہاں اختلاف کا پہلو نکلتا ہے اسے چھپاتا بھی نہیں۔ وہ مجھے دوست کہتے رہے ہیں، وہ مجھے تم کہتے ہیں۔ میں آپ کی سرحد سے نیچے نہیں آتا۔ وہ میری گمراہیوں کو نشان رد کرتے رہے ہیں، خطوط میں، میں بھی موقعے کو ضائع نہیں کرتا۔ لیکن ہم دونوں کے بیچ محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بعض ان کے حاشیہ نشیں اختلاف کا بیج بونے کی کوشش کرتے رہے ہیں لیکن ایسے لوگوں کو فاروقی صاحب بھی خوب سمجھتے ہیں۔

ہمایوں اشرف لیکن آپ بھی تو جدیدیت کے علمبردار رہے تھے؟

وہاب اشرفی آپ نے 'تھے' کا لفظ ٹھیک ہی استعمال کیا ہے۔ میں ادبی معاملات کو جامد و ساکت نہیں سمجھتا۔ کلاسیکی شاعری اپنے وقت میں اہم تھی، ترقی پسندی بھی وقت کی پکار تھی، جدیدیت کا اپنا وقت تھا، اب صورت بدل رہی ہے تو یہ بھی وقت کا ہی تقاضا ہے۔

ہمایوں اشرف تو آپ گوپی چند نارنگ کے ساتھ ہیں اب؟

وہاب اشرفی ہاں، مابعد جدیدیت کے سلسلے میں، میں کلّی طور پر ان کے ساتھ ہوں، اعتراف کرتا ہوں کہ مغرب کے بعض نکات کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے ''اردو مابعد جدیدیت' کی بوطیقا مرتب کی ہے۔ وہ اس معاملے میں سب سے آگے ہیں۔ یہ بوطیقا ملکی یا

مکھی بیٹھانے کا عمل نہیں ہے بلکہ مشرقی مطالبے اور مشرقی شعریات کے پس منظر میں وضع ہوئی ہے۔ انہوں نے سنسکرت کی روایت اور عربی فارسی روایات کے داعی بن کرنئی تھیوری سامنے لائی ہے، اور یہ عظیم کام ہے۔ اس سلسلے میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس طرح کی نظریہ سازی انہوں نے کی ہے وہ حالی کے بعد کسی نے نہیں کی۔

ہمایوں اشرف مابعد جدیدیت پر آپ کا بھی تو کام ہے'

وہاب اشرفی یقینی، ''مابعد جدیدیت ممکنات و مضمرات'' چھپ چکی ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تفصیلی مطالعے کی پہل سنجیدگی سے، نارنگ صاحب ہی نے کی ہے، راہ انہوں نے ہی دکھائی ہے۔

ہمایوں اشرف مابعد جدیدیت سے پہلے آپ نے جو کام کئے ہیں کیا وہ وقیع نہیں رہے؟

وہاب اشرفی میرے خیال میں ان کی اہمیت تو کم نہیں ہوئی۔ میری کتابیں اپنے وقت کے مطالبے کے تحت لکھی گئی ہیں، اس وقت کے مطالبات کیا تھے؟ یہ تو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔

ہمایوں اشرف اور عالمی ادبیات کی تاریخ کس مرحلے میں ہے؟

وہاب اشرفی آخری مرحلے میں، چھٹی جلد تیار ہو رہی ہے، زندہ رہا تو اسے بھی چھپی ہوئی شکل میں دیکھ لوں گا۔

ہمایوں اشرف مجھے یقین ہے کہ آپ کا سایہ ہم لوگوں کے سر پر بہت دنوں تک رہے گا۔ بیماریاں تو لگی ہی رہتی ہیں اور آپ کے حوصلے تو میں نے دیکھے ہیں تو پھر ایسی بات کیوں؟

(مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پروفیسر وہاب اشرفی اب جذباتی ہو رہے ہیں، کچھ اور سوالات کرتا لیکن مناسب نہیں معلوم ہوا)۔ تو میں نے کہا کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا، بہت بہت شکریہ۔

وہاب اشرفی آپ کا بھی شکریہ، معلوم نہیں میں نے کیا کیا بک دیا ہے۔

کتاب نما کے خصوصی شمارے

رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی کارنامے)

مرتبہ اطہر فاروقی

اردو میں ادبی تحقیق کو جن لوگوں کی بدولت آبرومندانہ مقام حاصل ہوا ہے، ان میں رشید حسن خاں کا نام ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے جنھوں نے اوہام و مفروضات کے ہر بت کو توڑنے اور ہر حقیقت کو واشگاف انداز میں بیاں کرنے کا فریضہ کسی تامل اور تکلف کے بغیر پوری جرأت اور راست بازی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اپنی اس شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے پچھلے چالیس برسوں میں مختلف موضوعات پر جس قدر اور جس پائے کا کام کر کے علمی کارکردگی کی جو قابل رشک مثال قائم کی ہے وہ ایک منفرد اور لائق تحسین امتیاز ہے۔ اردو کے اہم ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی تحریروں کا اہم مجموعہ۔

قیمت -/125 روپے

میر ببر علی انیس نمبر

مرتب علام حیدر

اردو زباں کے رثائی ادب کے خدائے سخن میر انیس کے دوسو سالہ یوم پیدائش پر پیش کیے جانے والے اہم مضامین کا مجموعہ۔ اس میں میر انیس کے فن، مرثیہ، سلام، رباعی، غزلیات اور مرثیہ خوانی پر ملکی اور غیر ملکی موجودہ ناقدین و مبصرین کے مضامین ● انیس کے مرثیوں کے انگریزی تراجم پر تبصرہ ● موجودہ شعرا کا منظوم خراج عقیدت، متقدمین کے تبرکات ● تبرکات کلام انیس (انتخاب) تصاویر اور عکس تحریر شامل ہیں۔

قیمت -/180 روپے

پروفیسر علی محمد خسرو حیات و خدمات

مہماں مدیر پروفیسر اختر الواسع

معاون مدیر فرحت احساس/ تجمل حسین

کتاب نما کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے اہم افراد پر خصوصی شمارے شائع کرتا رہا ہے۔ خسرو صاحب کا شمار بیسویں صدی کے ان گنے چنے دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ادبی، سیاسی، تہذیبی زندگی کے علاوہ اقتصادیات کے شعبے میں بھی گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ ملک کے نامور ادیبوں کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ، اس کا پیش لفظ جناب سید شاہد مہدی شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے لکھا ہے۔

قیمت -/90 روپے

مجتبیٰ حسین نمبر

مرتبہ ڈاکٹر محمد کاظم

... کالم نگار ... بھی۔ اس ... نے ان ...

قیمت -/125 روپے